آپ اپنے دام میں۔۔

فرحت اشتیاق

آپ اپنے دام میں

''انسان اور سب کچھ ہو بس اپنے والدین کی اکلوتی اولاد نہ ہو۔''

اپنی بیس سالہ زندگانی میں میں نجانے کتنی کروڑ مرتبہ یہ بات سوچ چکا ہوں۔ اکلوتا ہونا کسی سزا، کسی امتحان اور کسی آزمائش سے کم نہیں۔ ہو سکتا ہے بہت سے اکلوتے میری اس سوچ سے اتفاق نہ کریں۔ ان کے ہاں اکلوتا ہونے کا سلسلہ نسل در نسل نہیں چلا آرہا ہوگا۔ وہ اپنے والدین کی اور ان کے والدین اپنے والدین کی اکلوتی اولاد نہیں ہوں گے۔ وہ دو عدد معزز بزرگ خواتین جنہیں عرف عام میں نانی اور دادی کہا جاتا ہے سے محروم ہوں گے۔ کبھی کبھی سوچتا ہوں کہ کیا یہ ضروری تھا کہ میری طرح میرے امی اور ابو بھی اپنے اپنے والدین کی اکلوتی اولاد ہوتے۔ اگر مجھے اپنے والدین کا اکلوتا بیٹا ہونا ہی تھا تو کم از کم میرے دو چار تایا، چچا، خالہ، ماموں اور ان سب کے زیادہ نہ سہی ایک ایک دو دو بچے ہی ہوتے، پھر نانو اور دادی اماں کی توجہ چوبیس گھنٹے مجھ پر ہی تو مرکوز نہ رہتی۔

یہ دونوں معزز خواتین جو آپس میں دیورانی جٹھانی ہیں ان کے ہاتھوں میرا کیا حشر ہوتا ہے اور کیسی درگت بنتی ہے یہ میں آپ کو مفصل بتاؤں تو آپ کو مجھ پر جی بھر کر ترس آئے۔

میرے امی ابو آپس میں چچازاد، تایازاد کزنز ہیں۔ میرے نانا جی میرے دادا جان کے بڑے بھائی تھے۔ امی شادی سے پہلے بھی اسی گھر میں رہتی تھیں اور شادی کے بعد بھی۔ یہ گھر میری نانی کا بھی ہے اور دادی کا بھی اور ان دو عظیم اور قابلِ احترام ہستیوں کے یکجا ہونے ہی نے میری زندگی کو مشکل بلکہ مشکل ترین بنایا ہوا ہے۔ بیس سالوں سے میں ایک آزمائشوں بھری زندگی جی رہا ہوں۔ نانو اور دادی اماں کا بس چلے تو مجھے کبھی گھر سے باہر ہی نہ نکلنے دیں۔

''باہر مت جاؤ، دھوپ بہت تیز ہے۔''

''ہوا دیکھو کتنی ٹھنڈی چل رہی ہے، گرم کپڑے پہنے بغیر باہر نہ نکلنا۔''

''بارش ہونے والی ہے گھر پر ہی رہو۔''

میں جیسے ایک نازک اندام حسینہ تھا جسے سردی، گرمی، دھوپ، ہوا، بارش سب موسموں سے بچا کر رکھنا تھا۔ لاڈ پیار ایک حد میں ہو تو بندہ اس پر خوش بھی ہو۔ یہاں تو میرے لیے زندگی گزارنا ہی دشوار کر دیا تھا ان نازنخروں نے، ماضی میں خود پر بیتے درد والم کی زیادہ تفصیلات کیا بتاؤں۔

ذرا آج صبح ہی کا واقعہ سن لیجیے، آپ خود ہی میری مشکلات اور مصائب کو ٹھیک ٹھیک جان جائیں گے۔ ساڑھے دس بجے کا ذکر ہے۔ اب آپ سے کیا پردہ، میری صبح نو سے دس کے درمیان اور منہ اندھیرے والی صبح یعنی صبح کاذب نو اور ساڑھے نو کے درمیان ہوتی ہے۔ میری صبح صبح تھی مگر اس کا کیا

کیجیے کہ کالج کے لیے روز کی طرح لیٹ ہو چکا تھا۔

ڈائننگ ٹیبل پر جلدی جلدی ناشتے کے دو چار لقمے لے کر کالج کی طرف دوڑ لگانا چاہتا تھا مگر ڈائننگ ٹیبل پر میرے دائیں طرف بیٹھی نانو اور بائیں طرف بیٹھی دادی اماں مجھے اٹھنے دیتیں تو اٹھتا نا۔

''صبح صبح نہانے کی کیا ضرورت تھی؟ اس موسم میں احتیاط کرنی چاہیے، خدانخواستہ نزلہ زکام ہو گیا پھر؟''

نانو کی متفکر آواز سنتا میں اپنے سامنے گھی میں تر بتر ان تین بھاری بھرکم پراٹھوں اور گھی ہی میں تلے ان دو دیسی انڈوں کو بے چارگی سے تک رہا تھا۔ یہ مجھ جیسے فٹ اور اسمارٹ رہنے کی خواہش رکھنے والے نوجوان کا ناشتہ تھا اور یہ مجھے ہر حال میں تناول فرمانا تھا۔ امی جو مجھے ایک سیب، ایک ابلے انڈے، ایک پیالی کارن فلیکس اور چائے کا ایک کپ دینے کے بعد روزانہ ''بھوکے'' پیٹ کالج بھیج رہی تھیں ان کی دادی اماں کے ساتھ نانو نے بھی کافی طویل کلاس لی تھی۔

''اتنی مشکل پڑھائی اور اس پر سے ڈھنگ کا کھانا، ناشتہ بھی نہ ملے بچے کو۔''

دادی اماں...... آخر کو ساس ٹھہریں، انہیں اکثر امی سے شکایت رہا کرتی تھی مگر جب بات میری آتی تو نانو بھی دادی اماں کی ہم نوا بن جایا کرتی تھیں۔ میرا جم جانا، خود کو فٹ رکھنے کی کوششوں میں ہلکان ہونا، ایکسر سائز، جوگنگ سب کا ستیاناس اور بیٹا غرق کرنے کو مجھے گھی میں ڈوبی ''مقوی'' غذائیں کھلائی جارہی تھیں۔ گھی اور چکنائی کے نقصانات، کولیسٹرول اور وزن کے بڑھنے کی مشکلات اور پھر ان کے انتہائی مضر اثرات ہائی بلڈ پریشر یہاں تک کہ ہارٹ اٹیک کے خطرے تک کے بارے میں میں نے دبے لفظوں میں کئی بار بولنا چاہا پر مجھ طوطی کی آواز نقار خانے میں سننا کس نے تھی۔

''چپ بیٹھو، تم کل کے بچے کیا جانو گے کہ کس چیز میں کتنی غذائیت ہے۔ یہ احتیاط وحتیاط سب چالیس سال کے بعد کی جاتی ہے۔ تمہاری عمر ابھی کھانے پینے اور صحت بنانے کی ہے۔ اس عمر کا کھایا پیا ہی بڑھاپے میں کام آتا ہے۔ تمہاری عمر میں تمہارے دادا جان ناشتے میں پانچ پراٹھے اور پانچ ہی دیسی انڈوں کا آملیٹ اتنے شوق اور مزے سے کھالیا کرتے تھے۔''

اب اگر دادا جان کسی پہلوان کی اولاد تھے اور ان کا ہاضمہ بھی قابل رشک تھا تو اس میں مجھ بے چارے کی کیا خطا؟ میں معصوم ڈاکٹر انور حسین جیسے فٹ اور اسمارٹ انسان کا بیٹا ہوں جو زندہ رہنے کے لیے کھاتے ہیں۔ ایک ڈاکٹر کے گھر میں یہ سب ہو کیا رہا ہے؟

''یہ کیا ہے نانو؟'' میں پراٹھوں اور انڈوں سے نمٹ کر جیسے تیسے فارغ ہوا تو پتا چلا ابھی عشق کے امتحاں اور بھی ہیں۔

''چکن سینڈوچز بنائے ہیں، کالج کی کینٹین سے الٹی سیدھی چیزیں کھانے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔''

نانو اپنے ایک ہاتھ میں لنچ باکس اور دوسرے میں منرل واٹر کی بوتل لیے کھڑی تھیں۔ یہ تماشا ہمارے گھر میں روز ہوتا ہے۔ روز لنچ باکس میں ''غذائیت'' سے بھرپور کھانے کی چیزوں اور پانی کی ایک عدد بوتل کے ساتھ مجھے گھر سے روانہ کیا جاتا ہے۔ باہر کا پانی پینا مجھے منع ہے۔ مگر لے جانا یہ سب کچھ مجھے بغیر کسی چوں چرا کے ہوتا تھا کہ انکار کی صورت میں نتائج انتہائی خوفناک اور خطرناک نکلتے تھے۔ میں ان آنسوؤں سے کیونکر جیت

سکتا تھا؟ ادھر دادی اماں کی آنکھوں میں آنسو آتے، نانو کی شکل رونے جیسی بنتی ادھر میں سب احتجاج اور انکار بھول کر پسپائی اختیار کرتا۔

''نانو! تین تین صحت مند پراٹھوں اور دیسی انڈوں کے بعد لنچ؟ اتنا ہیوی ناشتہ کرنے کے بعد کوئی ہاتھی ہی لنچ کر سکتا ہے۔''

میں ہاروں گا، جانتا تھا پھر بھی ایک ناکام کوشش کرنے لگا۔

''خبردار جو اپنے آپ کو خود ہی ٹوکا ہو تو، خواہ مخواہ اپنے کھائے پیے کو خود ہی نظر نہ لگاؤ۔ ویسے بھی کل جب سے نرگس تمہارے قد کاٹھ کو ٹوک کر گئی ہے مجھے برے برے وہم آ رہے ہیں۔ بدذات نہ ماشاء اللہ بولی نہ کچھ اور ایسا منہ بھر کر ''قیس تو خاندان کے سب لڑکوں میں سب سے لمبا چوڑا ہے'' بول دیا۔ دادی اماں نے مجھے گھورا۔

''نرگس کی بات پر مجھے بھی ہول اٹھے تھے بھابی! ''منے'' کو نظر لگتی بھی تو اتنی جلدی ہے۔''

نانو نے دادی اماں کی بات سے جیسے ہی اتفاق کیا میں اک جھٹکے سے کرسی پر سے اٹھ کھڑا ہوا۔ اب قبل اس کے کہ نرگس آنٹی کی لگائی نظر اتارنے کے لیے کچن سے مرچیں لائی جائیں میں جلد از جلد گھر سے بھاگ جانا چاہتا تھا۔ نظر اتارے جانے والا یہ تماشا بلا ناغہ اور بلا مبالغہ روز ہوا کرتا ہے۔ ہر روز ہمارے خاندان میں سے، دوست احباب میں سے، پڑوسیوں میں سے کوئی نہ کوئی ایک آ کر مجھے نظر لگا جاتا ہے۔ (میں مسٹر یونیورس جو ٹھہرا۔)

میں ٹیبل سے اٹھ کر سیدھا ڈائننگ روم سے متصل لاؤنج میں امی کے پاس چلا آیا۔ وہ اتنی دیر سے میری بے بسی اور بے چارگی یقیناً دیکھ رہی تھیں مگر نانو اور دادی اماں کے آگے اختلاف رائے کا مطلب یہ تھا گویا دو دو سپر پاورز سے بیک وقت لڑائی مول لی جائے۔ امی صوفے پر بیٹھی سجدہ اور حیا کو پڑھانے میں مصروف تھیں۔

''جل تو جلال تو۔'' میں دل ہی دل میں نظر اتارے جانے سے بچنے کی دعائیں مانگ رہا تھا۔

''امی! میں جا رہا ہوں۔''

''اللہ حافظ بیٹا۔'' امی نے مجھے جواب دینے کے بعد دور ہی سے مجھ پر کچھ پڑھ کر پھونکا۔

اگر میرے کلاس فیلوز میں سے کسی کو پتا چل جائے کہ قیس انور حسین جو کالج کا ایک مقبول اسٹوڈنٹ ہے وہ اپنے بیگ میں لنچ باکس اور پانی کی بوتل رکھ کر کالج لاتا ہے تو وہ پتا نہیں میرا کتنا مذاق اڑائیں گے۔ ابھی تک تو یہ بات صرف میرے قریب ترین چار دوستوں تک ہی تھی اور وہ اکیلے میں یعنی جب صرف ہم پانچ ہوتے چاہے میرا جتنا مذاق اڑا لیتے، جتنی پھبتیاں کستے پر دوسرے کلاس فیلوز کے سامنے کبھی اس بات کا ذکر تک نہیں کرتے تھے، پھر بھی میں ڈرتا تھا۔

''سجدہ! دکھاؤ بیٹا سوال کتنا حل کر لیا تم نے۔''

امی مجھے فارغ کر کے دوبارہ اپنے پاس بیٹھی حیا اور سجدہ کی طرف متوجہ ہو چکی تھیں۔ 4th اور 5th کلاسز میں پڑھنے والی یہ دونوں بچیاں ہمارے دائیں طرف والے پڑوسی جاوید انکل کی بیٹیاں تھیں۔ یہاں چھ سو گز کے مکان میں ہم پانچ افراد رہا کرتے تھے اور ان کے ہاں اتنے ہی

مکان میں پانچ بھائی بمعہ اپنی آل اولاد کے رہا کرتے تھے۔ خیر سے ہر بھائی کے آٹھ آٹھ، نو نو بچے تھے اور جاوید انکل نے تو اپنے باقی چاروں بھائیوں کو بھی پیچھے چھوڑ دیا تھا۔ ان کے بارہ نہیں شاید تیرہ بچے تھے۔ شاید اس لیے کہہ رہا ہوں کہ کبھی اگر جاوید انکل سے یہ کہا جائے کہ وہ اپنے بارہ کے بارہ بچوں کے درست نام معہ اس بات کے کہ وہ کس کالج، کس اسکول اور کس کلاس میں پڑھتے ہیں بتا دیں تو میرا دعویٰ ہے کہ وہ کافی سوچ بچار کے بعد شروع کے پانچ چھ کے بارے میں تو بتا دیں گے مگر آخر والوں کی جماعتیں و درس گاہیں بہت سوچنے پر بھی انہیں شاید ہی یاد آسکیں۔

یقین کریں یہ مبالغہ آرائی نہیں۔ مجھے ایک بار یہ اتفاق ہو چکا ہے اسی لیے یہ بات اتنے وثوق سے کہہ رہا ہوں۔ جاوید انکل کو حیا اور سجدہ کے اسکول کا نام تو بہت سوچنے پر بھی یاد نہیں آیا تھا۔ ویسے آپس کی بات ہے اگر اکلوتا ہونا برا ہے تو بہت سارے بلکہ ڈھیر سارے بہن بھائیوں کا ہونا بھی برا ہی ہے۔

جاوید انکل کا گھر ''بیگ ہاؤس'' کہلاتا ہے۔ میرے حساب سے تو اس کا نام کباڑ ہاؤس، جنجال پورہ یا مچھلی گھر ہونا چاہیے تھا۔ اس گھر میں وہ چالیس پینتالیس افراد سماتے کیسے تھے میں نہیں جانتا، ہاں اتنا ضرور جانتا ہوں کہ اس جنجال پورے کی یہ دو معصوم بچیاں اپنے گھر میں والدین کی طرف سے توجہ میں کمی کے سبب ہمارے گھر بہت زیادہ آتی جاتی تھیں۔ امی میری سدا کی رحم دل اور ہمدرد خاتون، انہیں جی بھر کر والدین کی جانب سے عدم توجہ کا شکار ان بچیوں پر رحم آتا، وہ انہیں خوب پیار کرتیں، نتیجتاً وہ دونوں اپنے اسکول اور پڑھائی کے مسئلے مسائل لیے اکثر امی ہی سے رجوع کرنے لگیں۔

ویسے بچوں کی اس ریل پیل کے باوجود جاوید انکل اور آنٹی سلمیٰ نے اپنی بیٹیوں کے نام خوب سوچ بچار کر کے رکھے تھے۔ ایمان، سجدہ، حیا۔ چھوٹی دونوں بہنوں کے ساتھ کبھی کبھار بڑی بہن صاحبہ ایمان جاوید کی آمد بھی ہمارے گھر میں شروع ہوئی تو میں چڑ گیا۔

''آنٹی! فلاں ریسیپی، آنٹی! فلاں کڑھائی، آنٹی! فلاں ٹانکا۔''

ان بہنوں نے تو میری امی کا پیچھا ہی پکڑ لیا۔ جب دیکھو گھر میں موجود ہیں۔ مگر یہ چڑ اور یہ اعتراض فقط اس وقت تک رہا تھا جب تک کہ میں نے سجدہ اور حیا کی ''باجی'' کو دیکھا نہیں تھا۔ خاتون کافی سخت پردہ کرتی تھیں۔ گھر سے باہر بھی ذرا کم کم ہی دکھتی تھیں۔ اب اپنے گھر آنے جانے پر جو میں نے تھوڑی جھلک دیکھی تو وہ یہ بتانے کے لیے کافی تھی کہ ''باجی'' بہت زیادہ خوبصورت تھیں۔ خوبصورت لڑکیوں کے بارے میں معلومات ہر باذوق نوجوان رکھا کرتا ہے۔ یہ ایمان واقعی کسی کا بھی ایمان خراب کر سکتی تھی۔

خیر صاحب ''بیگ ہاؤس'' اور اس کے مکینوں کا ذکر مزید کر کے میں آپ کو بور ہرگز نہیں کرنا چاہتا۔ یہ ساری باتیں تو یونہی برسبیلِ تذکرہ شروع ہو گئی تھیں، میں تو دراصل اپنی بات کر رہا تھا۔ مرچوں اور مجھ میں جو مقابلہ جاری تھا میں اس کا ذکر کر رہا تھا۔ مرچیں کچن سے پہلے نکلیں گی یا گھر سے میں۔ تو جناب امی سے دعائیں لے کر میں جلدی سے مڑا۔ درمیان میں کہیں بھی رکے بغیر میرا اسید ھا پورچ میں پہنچنے کا ارادہ تھا لیکن برا ہو اس فون کی بیل کا، اس منحوس کو بھی اسی وقت بجنا تھا۔

''دیکھنا بیٹا! کس کا فون ہے؟''

امی نے توجہ اپنی شاگردوں ہی پر مرکوز رکھتے ہوئے مجھ سے کہا۔ میں نے فون کو گھورتے ہوئے ریسیور اٹھایا اور عجلت بھرے انداز

میں ''ہیلو'' کہا۔

''منے! آپ نے پانی کی بوتل رکھ لی بیگ میں اور دیکھیں آج ٹھنڈی ہوا چل رہی ہے، سویٹر پہننا مت بھولیے گا۔''

یہ ایک باریک اور کھنکتی ہوئی خوبصورت زنانہ آواز تھی مگر یہ مجھے خوبصورت کس طرح لگ سکتی تھی۔ میرا پارہ ایک دم ہی ہائی ہونے لگا۔ یہ بے ہودہ لڑکی میرا موڈ خراب کرنے کو صبح صبح پھر نازل ہوگئی تھی۔ اس سے پہلے کہ میں اسے جواب میں کچھ کہہ پاتا اندر کہیں سے نانو کی پاٹ دار آواز آئی۔

''منے! باہر ٹھنڈ ہے سویٹر پہن کر جانا۔'' اتنی تیز اور کراری آواز جسے سن کر مردہ بھی گھبرا کر اٹھ بیٹھے۔ غصے کے مارے میرا کیا حال ہو رہا تھا میں بتا ہی نہیں سکتا، اوپر سے ریسیور سے آتی اس کے کھلکھلانے کی آوازیں، وہ نانو کی بات کو کس قدر انجوائے کر رہی ہوگی۔ اپنی سہیلیوں کے درمیان بیٹھ کر وہ میرا کس قدر مذاق اڑائے گی۔ ریسیور بہت زور سے پٹخ دینے کے باوجود میرا غصہ اپنی جگہ قائم تھا، یہ آواز کس کی تھی میں نہیں جانتا ،ہاں مگر یہ آواز آج میں نے پہلی بار نہیں سنی تھی۔

پچھلے پندرہ دنوں سے اس لڑکی نے فون کر کر کے مجھے عاجز کر رکھا تھا۔ یقین کریں میں بدذوق نہیں ہوں، مجھ معصوم کے سینے میں بھی ایک دل دھڑکتا ہے جو ابو کے خوف اور دہشت کے باوجود بھی ہر خوبصورت حسینہ کے قرب کے لیے ہمکتا ہے۔ میری کسی پیش قدمی کے بغیر کوئی لڑکی ازخود میری طرف آئے، مجھے فون کرے، نیٹ پر چیٹنگ شیٹنگ کرے، ای میلز بھیجے تو سو بسم اللہ۔

مگر خوبصورت آواز والی ایک لڑکی فون کر کر کے میری دکھتی رگ پر ہاتھ رکھے، جن باتوں کو میں اپنے واقف کار لڑکوں تک سے چھپائے رکھنا چاہتا ہوں ان کا مزے لے لے کر ذکر کرے، مجھے چڑائے، میرا مذاق اڑائے تو کیا دل چاہے گا میرا؟ میرے ہاتھ میں ایک ریوالور ہو اور سامنے یہ بے ہودہ لڑکی۔ پتا نہیں یہ تھی کون اور اسے میرے بارے میں یہ ساری باتیں یہاں تک کہ میرا ''نک نیم'' تک کس طرح معلوم تھا۔

میرا نک نیم منا ہے۔ دیکھیں میں یہ بات دکھے دل سے آپ کو بتا رہا ہوں۔ اتنا واہیات نک نیم میرا رکھا کس نے تھا میں آج تک نہیں جان پایا۔ اگر جان لیتا تو اس شخص کو ہرگز نہ چھوڑتا۔ چند مستند راوی روایت کرتے ہیں کہ میری پیدائش کے بعد دادا، دادی، نانا، نانی، امی اور ابو سمیت کل چھ افراد میرا نام رکھنے کے امیدوار تھے۔ ہر ایک اپنا تجویز کردہ نام رکھنے پر مصر تھا سو پیدائش کے ایک ماہ بعد تک میرا نام فریقین کے کسی ایک نام پر متفق نہ ہونے کے سبب رکھا نہیں جا سکا تھا۔ اس دوران نجانے کس نے مجھے منا کہنا شروع کر دیا اور میرا اصل نام کہیں پیچھے رہ گیا۔ پھر جوں جوں میں بڑا ہوا امی اور ابو نے تو مجھے میرے اصل نام سے پکارنا شروع کر دیا مگر نانو اور دادی اماں نہیں مانیں۔ اسکول کے دنوں میں میرے کسی دوست کا فون آتا تو نانو یا دادی اماں ریسیور ہاتھ میں لیے ہوئے ہی اپنی زوردار کراری سی آواز میں مجھے پکارتیں۔

''منے! تمہارے دوست کا فون ہے۔''

نتیجہ ظاہر ہے حسب توقع ہی نکلتا۔ کلاس میں منا کہہ کہہ کر مجھے خوب رگیدا جاتا۔ وہ تو کالج میں آ کر میں نے نانو اور دادی اماں کے آگے باقاعدہ ہاتھ جوڑے تھے تب کہیں جا کر میری التجاؤں کا اتنا اثر ہوا تھا کہ وہ کسی آئے گئے اور دوستوں اور رشتے داروں کے سامنے مجھے منا کہنے سے احتراز برتنے لگی تھیں مگر یہ کون تھی جو میرے اتنے خفیہ قسم کے بچپن کے گھریلو نام تک سے آگاہ تھی۔

پندرہ دن قبل اس بے ہودہ لڑکی کی فون کال میں نے پہلی مرتبہ ریسیو کی تھی۔ ڈھٹائی تو ملاحظہ فرمایئے، کسی لڑکے کو کوئی لڑکی فون کرے اور وہ بھی اس کے موبائل پر نہیں بلکہ گھر کے نمبر پر۔

''آپ منے بول رہے ہیں؟''

میرے ہیلو کا جواب ایک مترنم سوالیہ آواز نے دیا تھا۔ میرا دماغ جیسے بھک سے اڑ گیا۔ اپنی کسی دھن میں ٹی وی پر چینل بدلتے بے دھیانی سے ریسیور اٹھانے والا میں ہکا بکا رہ گیا۔ ایک لڑکی کے منہ سے اپنے لیے یہ نام سن کر ظاہر ہے غصہ بھی بہت آیا۔

''میں قیس بول رہا ہوں، قیس انور حسین، آپ کون ہیں؟''

میں نے قدرے غصیلے انداز میں اپنا تعارف کروایا۔

''میں لیلیٰ ہوں۔'' مجھے لائن کے دوسری طرف دبی دبی سی ہنسی سنائی دی۔

''کیسا اتفاق ہے، آپ قیس ہیں میں لیلیٰ ہوں۔ ویسے آپ کے بارے میں تو سنا تھا کہ آپ صحرا میں اکیلے رہتے ہیں پھر شہر میں آمد کیسے ہوئی اور شہر میں آتے ہی قیس کا نام منا کیسے پڑ گیا؟'' اس لڑکی کی آواز بے شک بہت خوبصورت تھی مگر یہ خوبصورت مترنم سی آواز، باتیں اتنی بے ہودہ کر رہی تھی کہ میں اس آواز پر ہزار جان سے فدا ہو ہی نہیں سکتا تھا۔

غصے سے میرا دماغ کھولنے لگا تھا مگر اپنے غصے پر قابو رکھتے ہوئے اسے پہچان لینے اور اس کی آواز شناخت کر لینے کی خاطر نرمی سے پوچھنے لگا۔

''معاف کیجئے گا میں آپ کو پہچان نہیں پایا، آپ کہاں سے بات کر رہی ہیں؟''

''منہ سے۔'' کمال اطمینان سے اس دو لفظی جواب سے مجھے نوازا گیا اور اس جواب کے ملتے ہی مجھے کامل یقین ہو گیا کہ وہ جو کوئی بھی تھی ڈھیٹ ابنِ ڈھیٹ اور بدتمیز ابنِ بدتمیز ہر حال میں تھی۔

''آپ اپنی انگلیوں کو زحمت دے کر کوئی اور نمبر ٹرائی کیجئے اور پھر اپنے اسی منہ سے کسی فارغ اور بے کار آدمی کا بھیجا کھایئے، میرے پاس ان فضولیات کے لیے وقت نہیں ہے۔''

میں نے غصے سے بولتے ریسیور پٹخا۔ اگر وہ بار بار مجھے منا کہہ کر چڑا تی نہیں تو اتنے ''زہد و تقویٰ'' کا مظاہرہ ہرگز نہ کرتا۔ جس نمبر سے ابھی اس لڑکی نے کال کی تھی میں نے وہ بغور دیکھا۔ وہ ایک موبائل نمبر تھا جو میرے کسی بھی جاننے والے کا ہرگز نہیں تھا۔ جو میرے اتنے گھریلو نام سے آگاہ تھی وہ کوئی انجان لڑکی تو ہو نہیں سکتی تھی۔ میں نے تیز رفتاری سے ذہن دوڑا کر اپنی تمام کزنز اور کلاس فیلوز کو کھنگالنا شروع کر دیا۔

میں اس فون کال پر لعنت بھیج کر اسے بھولنے کی کوشش کر رہا تھا مگر وہ جو کوئی بھی تھی بڑی مستقل مزاجی اور ثابت قدمی کے ساتھ اس نے میرا پیچھا پکڑ لیا تھا۔

''منے صاحب! میں نے سنا ہے آپ دانتوں کے ڈاکٹر بن رہے ہیں۔'' اگلے روز وہ بے ہودہ لڑکی پھر فون پر موجود تھی۔ ''میں ڈینٹل

سرجن بن رہا ہوں جسے عام طور پر ڈینٹسٹ کہا جاتا ہے۔آپ کی اطلاع کے لیے اس پڑھائی کو بی ڈی ایس بیچلر آف ڈینٹل سرجری کہا جاتا ہے۔''

''دانتوں کا ڈاکٹر کہیں یا ڈینٹل سرجن، بات تو ایک ہی ہے۔ منے کو کسی بھی نام سے پکاریں رہے گا تو منا ہی۔''

نہ زندہ ہوا شیکسپیئر ورنہ اس لڑکی کو اس بے ہودگی کا مزہ وہی چکھاتا مگر میں آخر اس کے منہ لگ کیوں رہا ہوں، مجھے خود پر تاؤ آیا۔ابھی یہ سوچا ہی تھا کہ میری مردانہ انا ایک دم ہی بیدار ہوگئی۔

''لعنت ہے میری مردانگی پر، ایک لڑکی کی تیز زبان سے ڈر رہا ہوں۔''

ادھر میری مردانگی مجھے اس لڑکی کو کرارے کرارے سے جواب دینے کو مچل رہی تھی ادھر ڈائننگ ٹیبل پر بیٹھے ابو، امی، دادی اماں، اور نانو مجھ ہی کو بغور دیکھ رہے تھے۔

یہ فون ہمارے رات کے کھانے کے وقت آیا تھا۔ ڈائننگ ٹیبل پر بیٹھے اشخاص خصوصیت کے ساتھ ابو کی گہری نظروں نے میرے جوش کو ٹھنڈا کر کے خوف تلے ایک دم ہی دبا دیا۔

ان کا اکلوتا بیٹا جسے وہ پڑھا لکھا کر نجانے کتنا لائق اور کتنا قابل بنا دینا چاہتے تھے وہ بیس سال کی عمر میں طالب علمی کے دوران جبکہ ابھی وہ ان ہی کی دی ہوئی پاکٹ منی پر گزارا کرتا ہے، ان ہی کی خرید کردی ہوئی گاڑی میں ان ہی کے پیسوں کا پٹرول ڈال کر سارے شہر میں گاڑی دوڑائے پھرتا ہے، وہ عشق اور عاشقی جیسی خرافات میں پڑ گیا ہے۔ اگر نانو اور دادی اماں کا مجھ سے پیار بے تحاشا تھا تو ابو کے مجھ پر شکوک وشبہات بے انتہا۔ ان حالات میں میرے لیے بہتر یہی تھا کہ اس پٹاخہ کے منہ نہ لگوں۔ میں نے چمکار پچکار کر اپنی مردانہ انا کو تھپکی دے کر سلانا چاہا۔

''خاتون! آپ جو کوئی بھی ہیں، براہِ مہربانی آئندہ مجھے فون کرنے کی زحمت مت کیجئے گا۔''

''میں اس طرح کا لڑکا نہیں ہوں، بس یہی کہنے کی کسر رہ گئی ہے وہ بھی کہہ ڈالو۔''

میری مردانگی نے مجھ پر ہزار بار لعنت بھیجی۔ دوسری طرف میرے مہذب لہجے کے جواب میں وہ یوں چلائی گویا میں نے اسے کوئی بہت برا لفظ کہہ دیا ہو۔

''خاتون؟ آپ مجھے خاتون کہہ رہے ہیں، میرے خاتون بننے میں ابھی کم از کم بھی بیس پچیس سال کا عرصہ درکار ہے۔''

''درست فرمایا، ابھی تو آپ ارتقائی مراحل سے گزر رہی ہیں، سائنس دانوں کا ایک گروپ اس نظریہ پر پختہ یقین رکھتا ہے کہ انسان پہلے بندر تھا۔'' میں دانت پیستا ہوا طنزیہ بولا۔

''مرد بندر اور عورتیں بندریا۔'' میں نے دل میں اپنی تصحیح کی۔ دوسری طرف سے جلترنگ بجاتی ہنسی یوں سنائی دی جیسے میں نے اسے ملکۂ حسن کے خطاب سے نواز دیا ہو۔

''کس کا فون ہے قیس؟ کھانا ٹھنڈا ہو رہا ہے۔''

والد بزرگوار کی جاہ و جلال سے بھری کڑک آواز پر میں نے جھٹ ریسیور پٹخا اور سعادت مندی سے نظریں نیچی کیے ڈائننگ ٹیبل پر واپس آ گیا۔

''کس کا فون تھا؟'' انہوں نے تفتیشی انداز میں سر تا پاؤں مجھے بغور دیکھا۔

''وہ نوفل کو، کہہ رہا تھا کہ کل جو ٹیسٹ ہونے والا ہے اس کی......''

''اچھا ٹھیک ہے، کھانا کھاؤ۔'' انہوں نے میری بات درمیان سے کاٹ دی تھی۔ انہیں میری وضاحت پر یقین آ گیا۔ میں اس پر شکر کا سانس لیتا کھانے کی طرف متوجہ ہو گیا مگر یہ مصیبت صرف آج کے لیے نہ تھی کہ میں اس کے ٹل جانے پر مطمئن ہو جاتا۔

اگلے روز، پھر اس سے اگلے روز اور پھر اس سے بھی اگلے روز۔ گویا یہ کہانی روز کی ہو گئی۔ ڈھٹائی کی آخری حد یہ تھی کہ اگر میرے سوا گھر کا دوسرا کوئی فرد فون اٹھاتا تو بھی وہ مجھے بلوا لیا کرتی۔ اتفاق سے ابھی تک ابو نے اس کی کال اٹینڈ نہیں کی تھی ورنہ کب کی میری پیشی ہو چکی ہوتی۔ اور تو اور اب اس کی ای میلز بھی آنا شروع ہو گئی تھیں۔

اس کی تیسری فون کال پر جو نازو نے ریسیو کی تھی جب میں نے آ کر ریسیور کان سے لگا کر ہیلو کہا تو ایک دم ہی لگا جیسے کوئی بٹن دبایا گیا ہے اور فوراً ہی میرے کانوں میں کسی لڑکی کی سریلی سی آواز گونجی۔

''اچھی نانو، پیاری نانو، مانو بات ہماری

منے کو لکھنا پڑھنا ہے

دانتوں کا ڈاکٹر بننا ہے

نانو تلو میں پکاؤ

منے کو صحت مند بناؤ۔''

''نمبر تو میرے پاس آ چکا ہے، کرتا ہوں میں تم لوگوں کا کوئی انتظام۔''

میں غصے سے بے قابو ہو کر چیخا مگر میری چیخ کے جواب میں بھی وہی جنگل بجتا رہا۔ جیسے ہی ختم ہوا دوبارہ شروع، ریسیور زور سے پٹختے پٹختے میں رک گیا۔ ریسیور پٹخوں یا ٹیلی فون سیٹ کو اٹھا کر پھینکوں نقصان تو سراسر اپنا ہی ہے، اس سے اس بے ہودہ لڑکی کا تو کچھ بگڑتا تھا نہیں۔ دس پندرہ منٹ بعد جب مجھے اپنا غصہ قدرے کم ہوتا محسوس ہوا تو میں نے کچھ سوچ کر اسی موبائل نمبر کو ڈائل کیا جس سے ابھی مجھے کال کی گئی تھی۔

''ہیلو......'' دوسری طرف سے ایک بھاری بھر کم، خرانٹ قسم کی مردانہ آواز نے میرا استقبال کیا۔ میں خود کچھ چکرایا، کچھ ٹپٹایا مگر پھر اپنی ہمت جمع کر کے آواز کو رعب دار بنا کر بولا۔

''آپ کے نمبر سے فون کر کر کے مجھے تنگ کیا جا رہا ہے۔''

''میاں! ہوش میں تو ہو؟''

وہ بڑے میاں یوں غصے میں آئے جیسے میں نے انہیں گالی دے دی ہو۔ وہ صرف مجھ ہی کو کیا میرے آباؤ اجداد تک کو کھری کھری سنا دینے پر آمادہ نظر آئے تو مجھے فوراً ہی لائن کاٹنی پڑ گئی۔ یہ لڑکی میری توقع سے کہیں زیادہ چالاک تھی۔ میں نے چیک کیا تو پتا چلا اس کی اب تک کی ہر

کال الگ الگ موبائل نمبرز سے کی گئی تھیں۔

''پیاری ماں دعا کرو منا جلد بڑا ہو جائے۔''

''منے کو چاہیے میری پوری توجہ''

''ابھی تو منا صرف بیس سال کا ہے۔''

ٹی وی پر چلنے والے مختلف اشتہارات اپنی بے سری آواز میں ریکارڈ کر کے ہر روز مجھے سنائے جا رہے تھے، حسبِ سابق ہر بار کسی نئے موبائل نمبر سے اور بغیر کسی اضافی گفتگو کے۔

میں ان دنوں غصے سے پیچ تاب کھا رہا تھا۔ بس نہ چلتا تھا کہ کہیں سے یہ لڑکی مجھے مل جائے اور میں اس لڑکی کی گردن دبا ڈالوں۔ ان دنوں نانو اور دادی اماں کے چاؤ چونچلے ہمیشہ سے بھی زیادہ طیش دلانے لگے تھے۔ اپنے اکلوتے ہونے پر غصے اور بے بسی کے ملے جلے جذبات کا ہر وقت شکار رہنے لگا تھا اور آج پندرہویں دن صبح صبح کے وقت جبکہ میں اس بے ہودہ لڑکی کو بھلائے نانو اور دادی اماں کے ناشتوں اور لنچ وغیرہ سے نمٹنے میں مصروف تھا تب وہ فون پر پھر موجود تھی۔

آج کئی دنوں کے بعد ایسا ہوا تھا جب میرے لیے ریکارڈ شدہ پیغام نہیں بجا تھا۔ میں سارا دن یہ سوچ سوچ کر اپنا خون جلاتا رہا تھا کہ جس وقت اس کا فون آیا عین اسی وقت اس کی بے ہودگی پر مہر تصدیق ثبت کرتے نانو نے مجھے سویٹر پہننے کی نصیحت کیوں کی۔ اوائل دسمبر سے فروری کے وسط تک یا تو بوڑھے اور بیمار افراد سویٹر پہنتے ہیں یا پھر شیر خوار بچے۔ میری عمر کے لڑکے باہر آدھی آستینوں اور بغیر آستینوں کی شرٹس اور ٹی شرٹس، برمودہ شارٹس کے ساتھ پہنے مزے سے گھوم رہے ہیں اور نانو مجھے پوری آستینوں کی قمیص کے اوپر سویٹر بھی پہنوا رہی ہیں۔ صبح کی اس بات پر خراب میرا موڈ رات تک خراب ہی رہا۔

☆

رات کے کھانے کے بعد امی، دادی اماں اور نانو خاندان کی مختلف خواتین کا ''ذکرِ خیر'' کرتی ان کے گناہ بخشوانے میں مصروف تھیں۔ یہ خواتین، دوسری خواتین کو ڈسکس کرنے کی اتنی شوقین کیوں ہوتی ہیں؟ کس کے گھر میں کیا ہو رہا ہے اور کیوں ہو رہا ہے، سے انہیں اتنی دلچسپی کیوں ہوتی ہے؟

ابو اس گفتگو سے لاتعلق ٹی وی دیکھنے اور کافی پینے میں مگن تھے۔ میں کافی کے گھونٹ لیتا اس انتظار میں تھا کہ کب والدِ بزرگوار اٹھ کر اپنے کمرے میں جائیں اور میں گھر سے باہر یار دوستوں کی طرف نکلوں۔

ابھی میں اس انتظار ہی میں تھا کہ فون کی بیل بجی۔ کسی سولہ سالہ دوشیزہ کی طرح میرا دل اس بیل پر تیز تیز دھڑکنے لگا۔ ابو کے اٹھنے سے پہلے میں تیز رفتاری سے اٹھا اور جھپٹ لینے والے انداز میں ریسیور اٹھا لیا۔

''منے صاحب! آپ سویٹر پہنے بغیر کالج کیوں گئے؟ مجھے سارا وقت فکر رہی۔''

میں دانت پیستا کچھ کہنے ہی والا تھا کہ مجھے اچانک ہی ایک زوردار چھینک آئی۔

''دیکھا ہو گیا ناز کام، میں نے صبح کہا بھی تھا سویٹر پہن کر جاؤ پر بوڑھی نانی کی سنتا کون ہے۔''

پیچھے صوفے پر بیٹھی نانو میری چھینک پر ہول گئی تھیں۔ ہر نارمل انسان کو چھینک آتی ہے پر میری تو چھینک بھی ایک بہت بڑا اور گھمبیر مسئلہ ہوا کرتی تھی۔ ایک سے دوسری بار چھینک لوں تو جھٹ جوشاندہ قسم کی چیزوں سے میری تواضع شروع ہو جاتی تھی۔ میں ہمیشہ ہی ان باتوں پر چڑتا تھا۔ یہاں غصے اور کوفت سے میرا برا حال تھا اور وہاں لائن کے دوسری جانب وہ خوب زور سے کھلکھلائی تھی۔

''خدا جب حسن دیتا ہے نزاکت آ ہی جاتی ہے۔ جایئے منے صاحب! ایک کپ جوشاندہ پی کر دو تین لحاف لپیٹ کر لیٹ جائیں، خدانخواستہ ٹھنڈ بیٹھ گئی تو۔''

''سوری یہ رانگ نمبر ہے۔''

کہتے ہوئے میں نے اس کی بات مکمل ہونے سے پہلے ہی ریسیور کریڈل پر رکھ دیا۔ نانو کو کچھ کہنا بے کار تھا۔ خون کے گھونٹ پیتا اپنے کمرے میں آ گیا۔ ابو کے بیٹھے ہونے کا لحاظ نہ ہوتا تو آج میں اس لڑکی کو اس کے لڑکی ہونے کی پرواہ کیے بغیر بہت کچھ کہہ دیتا۔ کیا پابندیوں اور خوف میں جکڑی زندگی ہے مجھ بے چارے کی۔ لڑکیوں کی طرح ڈر ڈر کر اور سنبھل کر چلنا پڑتا ہے۔

☆

''منے بھائی جان! آپ کا فون ہے۔''

یہ نازو صاحبہ تھیں۔ جو گرز کے تسمے باندھتا میں غصے میں گھوما۔ ہماری یہ ملازمہ صاحبہ عمر میں مجھ سے چار پانچ سال بڑی ہی ہوں گی پر احتراماً مجھے منے بھائی جان کہا کرتی تھیں۔ چونکہ وہ اور اس کا باپ شروع ہی سے ہمارے پاس ملازم تھے لہٰذا نازو صاحبہ کا بچپن ہمارے ہی ہاں گزرا تھا۔ نانو اور دادی اماں سے سن سن کر ہی اس نے مجھے منے بھائی جان کہنا شروع کر دیا تھا۔ پہلے کبھی اس کا یہ کہنا برا نہیں لگا تھا پر اب جب وہ بولتی جی چاہتا اس کا سر پھاڑ دوں اور وہ......۔

''عادت پڑ گئی ہے۔'' کہہ کر میری ڈانٹ کا معصومیت سے جواب دے دیا کرتی تھی۔

''کتنی بار کہا ہے تم سے، خالی بھائی کہا کرو۔ یہ آگے پیچھے کسی بھی قسم کے دم چھلے لگنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔'' اسے جھاڑ پلاتا میں کمرے سے نکل کر فون کی طرف آ گیا تھا۔

''تم لوگوں کو مینرز آتے جا رہے ہیں، میری سالگرہ یاد آ گئی۔''

بغیر سلام دعا اور ہائے ہیلو کے میں خوشگوار سے لہجے میں بولا۔

''آج میرے منے کی سالگرہ ہے۔''

میرا جملہ مکمل بھی نہیں ہونے پایا تھا کہ میرے کانوں میں یہ فلمی گیت گونجا۔ میرے ہونٹوں پر سے فوراً ہی مسکراہٹ رخصت ہوئی۔ دانت

پیتے اور مٹھیاں بھینچتے میں اپنی سالگرہ کی بے ہودہ ترین مبارک باد وصول کر رہا تھا۔

''میرا امنا ہوا بیس سال کا، لنچ باکس لے کے نکلا میرا امنا، لنچ باکس۔''

بس اب حد ہو چکی تھی۔ کوئی قیس انور حسین کا مذاق اڑائے اس پر جملے کسے؟ آس پاس کسی کو نہ پا کر میں نے اردو اور انگریزی میں ملا جلا کر دو چار سخت قسم کی گالیوں سے مشابہ الفاظ بک کر لائن کاٹ دی۔

غصے میں بکتا جھکتا کالج روانگی کے لیے گھر سے نکلنے لگا تو سامنے والے ریاض انکل کے گیٹ پر نازو کھڑی نظر آئی۔ جتنی دیر میں میں نے گاڑی باہر نکالی ان کا گیٹ کھل چکا تھا۔ گیٹ کھولنے والی ہستی نشو کی تھی، ریاض انکل کی دوسرے نمبر کی بیٹی۔ اصلی نام نوشین تھا مگر گھر اور گھر سے باہر ہر جگہ نشو کہلائی جاتی تھی۔ فیشن کے پیچھے اندھا دھند بھاگتی تھی۔ زیادہ کپڑوں سے اسے الجھن ہوتی تھی یا غالباً یہ نظریہ پیش نظر رہتا تھا کہ ایک غریب اور پسماندہ ملک کی شہری ہونے کے سبب یہ اس کی اخلاقی ذمہ داری ہے کہ بچت جس جگہ اور جتنی ہو سکے کر لینی چاہیے۔

والدہ صاحبہ کا یہ حال کہ بیڈ شیٹ کے برابر کی چادر سر سے پاؤں تک لپیٹ کر پھرتی تھیں اور جسے حقیقت میں پردے کی ضرورت تھی وہ آستینوں اور کندھے پر کپڑے کی جگہ ڈوریوں سے کام چلا لیا کرتی تھی۔ گلوں کی آگے اور پیچھے سے گہرائی بھی ہم لڑکوں کے لیے قابل توجہ اور لڑکیوں کے لیے قابلِ اعتراض ہوا کرتی تھی۔ ہاں تو میں نازو صاحبہ کی بات کر رہا تھا جو ریاض انکل کے گیٹ پر کھڑی تھیں، نازو اور نشو دونوں نے میری طرف دیکھا تھا۔ نازو بیگم نے تو باقاعدہ ہاتھ ہلا کر مجھے خدا حافظ بھی کیا مگر میں نے جواباً گردن ہلانے کی بھی زحمت نہ کی۔ وجہ اس کی یہ نہیں کہ میں ملازمین کو کم تر سمجھتا ہوں۔ بات یہ ہے کہ مجھے اس کی اس نئی ملازمت سے شدید اختلاف تھا۔ وہ باپ بیٹی ہمارے کل وقتی ملازم تھے اور جس وقت کی ہم اسے تنخواہ دیتے تھے اس وقت میں سے وقت نکال کر ہمارے کاموں میں ڈنڈی مار کر وہ ریاض انکل کے گھر بھی کام کرنے جانے لگی تھی اور یہ سلسلہ گزشتہ دو تین ماہ سے جاری تھا۔ میرے اعتراض کے جواب میں امی کی رحم دلی تھی۔

''مجھ سے اجازت مانگ رہی تھی مجھے منع کرنا اچھا نہیں لگا۔ کچھ اضافی پیسے ہی بے چاری کے ہاتھ لگ جائیں گے۔ دوسروں کا بھلا سوچو تو اپنا بھی بھلا ہوتا ہے۔''

امی کا اور میرا اسی مشہور لطیفے جیسا حال تھا جس میں ماں بچے کو سمجھاتی ہے کہ

''بیٹا ہم اس دنیا میں دوسروں کی خدمت کے لیے آئے ہیں۔'' اور بیٹا تعجب سے پوچھتا ہے کہ ''پھر دوسرے کس لیے آئے ہیں؟''

☆

ہم سب کا آج کاشف کے گھر رات بھر رکنے اور جاگنے کا پروگرام تھا۔ مقصد اس اجتماع اور شب بیداری کا ساتھ بیٹھ کر پڑھائی کرنا تھی۔ (سچی سے) اس بار ہم سب کا مصمم ارادہ تھا کہ شروع سال سے لگ کر پڑھائی کریں گے (یہ عہد و پیمان ہر تعلیمی سال کے آغاز پر خود سے ضرور ہوتے تھے مگر عمل درآمد کے وقت پتا نہیں کیوں گڑبڑ ہو جاتی تھی۔) کتابیں کھولنے اور پڑھائی شروع کرنے سے پہلے میں اپنے دوستوں کے سامنے اپنا تازہ ترین مسئلہ رکھنا چاہتا تھا۔ اس لڑکی کو مزا چکھانے کو شاید میرے دوستوں کے پاس کچھ ڈھنگ کے مشورے اور تجاویز ہوں۔

''اوئے ہوئے ہمارے شہزادے کو لڑکیاں چھیڑ رہی ہیں۔ قیس مجھے تیری قسمت پر رشک آ رہا ہے۔''میرا دکھڑا سنتے ہی زلفی چہرے پر معنی خیز مسکراہٹ لیے بولا۔

''توبہ ہے، کیسا وقت آ گیا ہے۔ پہلے لڑکے لڑکیوں کے پیچھے پڑتے تھے اب لڑکیاں خود لڑکوں کے گلے پڑ رہی ہیں۔'' نانی دادی کی صحبت میں رہتا تو میں ہوں پر ان کی طرح توبہ توبہ کیسا زمانہ آ گیا اور کیسا وقت آ گیا جیسے فقرے بولنے کی پکی عادت کاشف کی تھی۔ نوفل، کاشف اور زلفی تو میری طرف متوجہ تھے مگر مومن چہرے کے آگے کوئی ہفتہ وار میگزین پھیلائے اس میں محو تھا۔

''اس کمینے کو دیکھو دوست کی پریشانی کا کوئی احساس ہی نہیں ہے، مگن ہے اپنے میگزین میں۔''

میں با آواز بلند زلفی سے بولا۔ ان دنوں میں بہت زود رنج اور حساس ہو رہا تھا اسی لیے مومن کی عدم دلچسپی بے تحاشا کھٹک رہی تھی۔

''تم لوگوں سے ایک پہیلی پوچھوں؟''

مومن نے میری ناراضی و شکوہ بھری آواز ظاہر ہے سن لی تھی مگر اس کے لیے میگزین میں پڑھی گئی پہیلیاں مجھ سے زیادہ لائق توجہ تھیں۔ ''یہاں میں اپنے مسئلے میں الجھا ہوں اور اسے پہیلیوں کی پڑی ہے۔''میں بری طرح چڑا۔

''دو پہاڑ ہیں، ان کے بیچ میں ایک دریا ہے۔ ان پہاڑوں میں سے پہلے والے پہاڑ کے پیچھے ایک گنجا آدمی بیٹھا ہے۔ دوسرے پہاڑ کے پیچھے کچھ پرندے اڑ رہے ہیں۔ پہلے والے پہاڑ کے پیچھے بیٹھا آدمی بال کٹوا رہا ہے، بتاؤ اس کا مطلب کیا ہوا؟''

مومن اسم بامسمیٰ ہرگز نہ تھا۔ ماں باپ کے رکھے اس نام کی لاج وہ ذرا کم کم ہی رکھا کرتا تھا۔ اس وقت وہ کون سی مومنانہ حرکت کرنے کے موڈ میں تھا ہم سب سمجھ چکے تھے۔ اتنی دیر سے یہ میگزین پڑھے جانے کا ڈرامہ کس خوشی میں ہو رہا تھا ہم سب جان چکے تھے۔ ہم سب کے چہروں پر دبی دبی سی مسکراہٹ ابھر رہی تھی جسے زلفی کے خوف سے ہم سب بمشکل کنٹرول کر رہے تھے جبکہ مومن صاحب مجسم شرافت بنے اور چہرے پر سنجیدگی لیے ہم سب کی طرف دیکھ رہے تھے۔ زیادہ غور سے زلفی کی طرف جو کچا چبا جانے والی نظروں سے مومن کو گھور رہا تھا۔

''چلو یہ پہیلی نہیں بوجھ پا رہے تو میں دوسری پوچھ لیتا ہوں۔ ایک گنجا جب سوئمنگ پول سے نہا کر نکلا تو وہ پورا گیلا ہو چکا تھا مگر اس کے بال گیلے نہیں ہوئے تھے۔ بتاؤ کیوں؟''

وہ معصومیت سے بولا۔ ہم تینوں سے ہنسی روکنا محال تھا۔ زلفی دانت پیستا ہوا اپنی جگہ سے اٹھ چکا تھا۔

''ٹھہر جا سالے گنجے کے بالوں کے گیلا نہ ہونے کی وجہ میں تجھے بتاتا ہوں۔'' وہ آستینیں چڑھاتا مومن کے سر پر پہنچ چکا تھا۔ مومن نے میرے پیچھے چھپنے کی کوشش کی مگر میں ہاتھ جھاڑتا فوراً آگے سے ہٹ گیا۔

''یارو بچاؤ، کیسے دوست ہو، دوست کی مدد کو نہیں آ رہے۔'' مجھے ہری جھنڈی دکھاتے دیکھ کر اس نے باقیوں کو دہائی دی۔

''خود غرضو، پنگا لیا کیوں؟''

دبلا پتلا مومن پہلوان نما زلفی سے اپنے بچاؤ کی کوششوں میں مصروف تھا مگر زلفی اسے بخشنے کے موڈ میں نظر نہیں آ رہا تھا۔ اس بے چارے

کے بال گزشتہ ایک ڈیڑھ سال کے اندر اندر اتنی تیزی سے گرے تھے کہ اب اسے با آسانی اور بغیر کسی تکلف کے گنجا کہا جا سکتا تھا۔ یہ اس کے لیے انتہائی سنگین مسئلہ تھا۔ ایک تو وہ پہلے ہی انکل انکل جیسا نظر آتا تھا، لے دے کر کسر بالوں نے پوری کر دی تھی۔

مومن کہتا تھا کہ جو چند لٹیں بالوں کی اس کے سر پر رہ گئی ہیں اگر وہ بھی نہ ہوں تو وہ بڑے آرام سے بزرگ شہریوں میں شمار ہونے لگے گا۔ پھر اسے کتنے فائدے حاصل ہوں گے، کہاں کہاں اس کا ٹکٹ آدھا لگے گا، کہاں کہاں اسے قطار میں نہیں لگنا پڑے گا اور کہاں کہاں اس کا داخلہ مفت ہو جائے گا۔

وہ زلفی سے پٹتا تھا پر اسے چھیڑنا بند نہیں کرتا تھا۔ مومن کچھ بھی کہتا ہو پر زلفی سے ہم سب کو ہمدردی تھی۔ لڑکیاں پہلے زلفی انکل کو کچھ خاص گھاس نہیں ڈالتی تھیں، بالوں نے رہی سہی آس بھی ختم کر دی تھی۔ ان دنوں فرسٹ ایئر کی نوخیز کلی جیسی ایک مہ جبین سے اسے پہلی بار سچا عشق ہوا تھا (گویا اس سے پہلے ساٹھ ستر جھوٹے عشق ہوئے تھے) اور وہ حسین، نازنین ہمارے گنجو دوست پر ایک نگاہ تک ڈالنے کی روادار نہ تھی۔

کاشف کے کمرے میں اس وقت ایک ادھم مچا ہوا تھا۔ مومن چھلاوے کی طرح کبھی ادھر کبھی ادھر اور زلفی جو پہلے ہی دو چار ہاتھ تو اسے جڑ ہی چکا تھا اس کی ٹھیک ٹھاک دھلائی کرنے کی نیت سے اس کے پیچھے۔ اس بھاگ دوڑ اور دھینگا مشتی میں کاشف بے چارے کی آواز کون سنتا، جو کبھی کمرے کے بند دروازے کی طرف دیکھ رہا تھا اور کبھی بھاگ دوڑ کرتے اپنے دوستوں کی طرف۔

"بس کرو تم لوگ۔" چند منٹوں میں اس کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو چکا تھا۔ اس کی دھاڑ ایسی تھی کہ گنجو اور پتلو دونوں فوراً رک گئے۔

"بابا سے ڈانٹ پڑوانی ہے کیا مجھے؟ مانا کہ وہ قیس کے ابو کی طرح غصے کے تیز نہیں مگر ان بے ہودہ آوازوں اور چیخ و پکار پر تو کسی ٹھنڈے مزاج کے آدمی تک کو غصہ آ سکتا ہے۔ ذرا وقت دیکھو رات کا ڈیڑھ بج رہا ہے۔"

اس ڈانٹ کا اثر یہ ہوا کہ مومن صاحب جو خود کو بچانے کی کوشش میں رائٹنگ ٹیبل پر چڑھ کر کھڑے تھے انسان کے بچوں کی طرح نیچے اتر آئے۔

زلفی مومن کو کینہ توز نگاہوں سے گھورتا ہوا کہنے لگا۔

"اسے کچھ نہیں کہہ رہے جو کمینگی شروع کرتا ہے۔ خبیث نے سارے لطیفے اور ساری پہیلیاں گنجوں کے بارے میں یاد کر رکھی ہیں۔" کاشف کے سمجھانے پر زلفی غصے سے بولا۔

"تم لوگ بس آپس میں فضول باتوں پر جھگڑتے رہنا اور میں جو اپنا اتنا اہم مسئلہ بیان کر رہا ہوں اسے تو کوئی اہمیت ہی نہیں دی جا رہی۔" میں نے دوستوں سے شکوہ کیا۔

"تمہارا مسئلہ سرے سے مسئلہ ہی نہیں ہے۔"

مومن کو چونکہ اب گنجوں کے متعلق سوچنے سے فرصت مل چکی تھی اسی لیے اس نے پہلی بار میرے مسئلے پر لب کشائی کی۔ "یہ مسئلہ نہیں ہے تو پھر کیا ہے؟" میرا انداز مکمل طور پر لڑنے والا تھا۔

جس چیز نے مجھے اتنا چڑا کر رکھا ہوا ہے، اتنا عاجز کیا ہوا ہے وہ اسے مسئلہ ہی ماننے سے انکار کر دے۔

''بھئی سیدھی سی بات ہے اگر کوئی لڑکی خود تم سے فری ہو رہی ہے، تمہیں فون کر رہی ہے تو تمہارا کیا جاتا ہے۔تم بھی انجوائے کرو۔''

''انجوائے کرو؟ وہ میرے ابا حضور کی شک وشبہ اور جاہ وجلال سے بھری لال انگارہ آنکھیں دیکھی ہیں۔تم میں سے کوئی بے وقت ملنے آجائے تو تفتیش شروع ہو جاتی ہے۔ کیوں آیا تھا، کس لیے آیا تھا۔کسی لڑکی کا نام سن لیا تو میری کھال ادھیڑ کر رکھ دیں گے۔ ہونہہ تمہارا کیا جاتا ہے، انجوائے کرو۔''

میں نے چڑچڑے پن سے جواب دیتے اسی کے لہجے کی نقل بھی اتاری۔''خیر آپ نہ اتنے ولی ہیں اور نہ والد بزرگوار سے ایسے ڈرنے والے، تمام تر روک ٹوک اور تفتیشی پروگرام کے باوجود اپنے لیے خفیہ راستے نکال ہی لیتے ہیں۔ سچ بات کچھ یوں ہے برخوردار! کہ محترمہ ہمارے میاں مجنوں سے پیار محبت کی پینگیں بڑھانے کے لیے نہیں بلکہ اس کا مذاق اڑانے کے لیے فون کرتی ہیں اور یہی اصل سبب ہے آپ کے اس سے چڑنے کا۔''

نوفل اتنی دیر میں پہلی مرتبہ کچھ بولا بھی تو ایسا جو میرا دل جلا کر رکھ دے۔وہ سیدھی اور صاف بات کیا کرتا تھا۔

نوفل کا منہ پھٹ پن مجھے بہت برا لگا تھا گو دل سے میں تسلیم کر رہا تھا کہ وہ صحیح کہہ رہا ہے۔ابو کے تمام تر خوف اور دہشت کے باوجود میں اس لڑکی کی کالز کو کھلے دل سے خوش آمدید کہتا اگر وہ میرا مذاق اڑانے، مجھ پر جملے کسنے اور میری دکھتی رگ کو چھیڑنے کی کوشش نہ کرتی تو۔

''تمہیں میری مشکل کا حل بتانا ہے تو بتاؤ۔اپنی یہ سچ گوئی اور حق پرستی کسی اور وقت کے لیے اٹھا کر رکھو۔'' میں نے ذرا اکڑ دکھاتے ہوئے ناراضی کا اظہار کیا۔

''ہاں بھئی حل بتانا ہے تو بتاؤ۔ یہاں اس باحیا، پاک دامن اور شریف نوجوان کی عزت خطرے میں پڑی ہے اور تمہیں صاف گوئی اور حق پرستی سوجھ رہی ہے۔'' زلفی کی شکل دیکھ کر مجھے پہلے ہی پتا چل چکا تھا کہ اس کی زبان میں کھجلی ہو رہی ہے۔

''ہائے اللہ نہیں! اگر دنیا والوں کو پتا چل گیا تو تمہاری کتنی بدنامی ہوگی، یہ ظالم دنیا والے تو تمہیں جیتے جی مار ڈالیں گے۔''

ایک مشہور فلمی اداکارہ کے انداز میں فرضی دوپٹے کا پلو منہ میں لے جاتے اور سانس دھونکنی کی طرح جلاتے ہوئے مومن بولا۔

''مومن! بری بات ہے، قیس بیزار بیٹھا ہے تجھے اٹکھیلیاں سوجھی ہیں۔'' زلفی نے خباثت سے ہنستے اسے شاعرانہ ڈانٹ پلائی۔

''لعنت ہے مجھ پر ہزار بار لعنت ہے جو تم جیسے خبیثوں اور کمینوں کو اپنا دوست سمجھ کر اپنی پریشانی بتائی۔'' میں غصے سے لال پیلا ہوتا فوراً ہی کرسی پر سے اٹھ کھڑا ہوا۔

''کیا ہو گیا ہے یار! دوستوں کے مذاق کا برا مان رہے ہو؟ بیٹھو آرام سے اور تم سب میں سے بھی اب کوئی فضول بکواس نہیں کرے گا۔'' کاشف نے مجھے پیار سے چمکارتے اور ان دونوں کو غصے سے گھورتے ماحول کی کشیدگی کو جلدی سے ختم کیا۔وہ ہم پانچوں میں سب سے زیادہ صلح جو اور معاملہ فہم بلکہ بقول ابو کے میرا ڈھنگ کا واحد دوست تھا۔

''ہاں ٹھیک ہے، میں اپنا مذاق اڑائے جانے پر چڑتا ہوں مگر ہم میں سے ایسا کون ہے جو اپنا مذاق بنتا دیکھ کر غصے میں نہ آئے۔ نانو اور

دادی اماں کے زبردستی کے لاڈ پیار نے یہ دن دکھایا ہے۔ لے کر ایک لڑکی کے ہاتھوں میرا تماشا بنوادیا۔'' دوستوں کے آگے سچ بولنے میں ایسا کچھ مضائقہ بھی نہیں تھا۔

''اسے تمہارا ای میل ایڈریس کیسے پتا چلا؟''

اس قسم کے احمقانہ سوالات زلفی صاحب ہی کر سکتے تھے۔

''ابے موٹے دماغ میں بھیجہ ہے کہ نہیں۔ بالوں کے ساتھ ساتھ کیا عقل کو بھی رخصت کر دیا ہے، جو اس کے گھر کا فون نمبر، اس کے گھر کی اور اس کی ذاتی زندگی کی ہر بات یہاں تک کہ اس کا ''نک نیم'' تک جانتی ہے اس کے لیے ای میل ایڈریس معلوم کر لینا کون سا مشکل کام ہے؟'' نوفل نے زلفی کو گھر کا۔

''نک نیم'' کے لفظ سے مجھے ایسا لگا جیسے کسی نے میری دم پر پاؤں رکھ دیا ہو مگر بات چونکہ میرے ہی حق میں ہو رہی تھی اس لیے احتجاج کا ایک لفظ منہ سے نہ نکالا۔ میں اپنی شکل اور اپنے درد والم کا بالکل ٹھیک ٹھاک اندازہ دوستوں کو کروانے کے لیے کاشف کا کمپیوٹر آن کر کے کرسی پر بیٹھ گیا۔ چاروں میرے گرد جمع تھے۔ ان دل جلانے والی ای میلز کو پڑھنے کے لیے بے قرار تھے جو میں انہیں پڑھوانا چاہتا تھا۔ میں Hot mail اور Yahoo دونوں جگہ Sign in ہو چکا تھا۔ پہلے کی تمام میلز میں Delete کر چکا تھا مگر جو تازہ بہ تازہ آج ہی پہنچی تھیں وہ سب ایک شان سے میرے Inbox میں موجود تھیں۔

''منے کا بچپن۔'' یہ پہلی میل کا سبجیکٹ تھا۔ تفصیلات بھی سبجیکٹ سے کچھ کم نہ تھیں۔

مجھے غصے میں کرسی پر سے اٹھتا دیکھ کر کاشف نے ڈپٹ کر دوبارہ بٹھایا۔ مجھے بٹھا کر کاشف خود ہی دوسری میل کھولنے لگا۔

''لگتا ہے خاتون ٹی وی بہت ذوق وشوق سے دیکھتی ہیں۔'' بولتے بولتے جو اس کی اس دوسری میل میں موجود مواد پر نگاہ پڑی تو اپنی رائے میں ذرا ترمیم کرتا جھٹ بولا۔

''شعروشاعری کا بھی کافی شوق ہے محترمہ کو۔''

لاکھ پردوں میں چھپائے منا خود کو، بھید اس کے کھولتی ہے

یہ لڑکی سچ بولتی ہے!

شاعرانہ بکواس سے مزین یہ ایک طویل مضمون کا عنوان تھا جسے جلی حروف میں انڈر لائن کر کے ٹائپ کیا گیا تھا۔ نیچے مضمون بے حد طویل بے حد طویل تھا اور ہم سب دوست اسے ایک ساتھ مل کر پڑھ رہے تھے۔

''منے کی شان میں یوں تو دیوان کے دیوان کہے جا سکتے ہیں پھر بھی کوشش کر رہی ہوں کہ کم لفظوں میں منے کو بھرپور انداز میں خراجِ تحسین پیش کر سکوں۔''

منے کی شان میں پہلی نظم حاضرِ خدمت ہے۔ جس کا عنوان بھی ''منا'' ہی ہے۔

''منا''

یہ بستہ، یہ ٹفن، یہ پانی لیے منا
یہ دادی اماں کا بگاڑا منا
یہ نانو کی آنکھ کا تارا منا
یہ منا اگر مل بھی جائے تو کیا؟
لٹا دو اسے، سلا دو یہ منا
مرے سامنے سے ہٹا دو یہ منا
تمہارا ہے نانو تم ہی سنبھالو یہ منا
یہ منا اگر مل بھی جائے تو کیا ہے؟

''ارے یہ ساحر کی نظم کا کیسا بیڑا غرق کیا ہے اس لڑکی نے۔'' عاشق مزاج اور شعر و شاعری کا شوقین زلفی چلایا۔کم بخت کو میرے بیڑا غرق ہونے پر نہیں کسی ساحر کے بیڑے کے غرق ہونے کا غم لاحق ہو رہا تھا۔

''چپ بیٹھو، پڑھنے دو آگے کیا لکھا ہے۔'' نوفل نے پیچھے سے زلفی کو ایک دھموکا جڑا۔

''باؤلا ہونا منے کا ٹفن کی تلاش میں''

ہے ہے منے کا لنچ لے گیا کون
ہے ہے منے کو جُل دے گیا کون
ہاتھوں سے اگر کسی نے اٹھایا نہیں ہے
ہوا بن کر تو لنچ اڑا نہیں ہے
کاشف تو دکھا کدھر گیا لنچ
مومن تو بتا کدھر گیا لنچ

''یہ تو قیس کے ساتھ ساتھ ہم سب کو بھی جانتی ہے۔''

زلفی پھر بولا اور پھر اس نے نوفل کا ہاتھ کھایا۔ میں مونیٹر کے ساتھ گاہے گاہے اپنے دوستوں کی طرف بھی دیکھ رہا تھا۔ سب کے چہروں پر سنجیدگی مگر آنکھوں میں ہنسی صاف نظر آ رہی تھی۔ یہ ای میل چونکہ میں نے بھی ابھی ابھی ہی پڑھی تھی اس لیے میرا منہ غصے سے مزید پھول چکا تھا۔ نظریں میری پھر سے غیظ و غضب کے عالم میں مونیٹر کو گھور رہی تھیں۔

"ابھی کچھ سال لگیں گے"

ابھی کچھ سال لگیں گے

نانو، دادو سے لاڈ اٹھواتے منے کے بڑا ہونے میں

ابھی کچھ سال لگیں گے

کالج لنچ لے جانا چھوڑنے میں، بن سویٹر کے گھر

سے نکلنے میں

ابھی کچھ سال لگیں گے

منے کے بڑا ہونے میں

ابھی کچھ سال لگیں گے

"اور اب آخر میں کچھ متفرق اشعار اور مصرعے۔"

یہ کارنامہ بھی منا کبھی دکھائے ہمیں
کہ لنچ و پانی بنا کالج جاتا نظر آئے ہمیں

کمرۂ امتحان میں منا تھا اداس بیٹھا
کہتا تھا پیپرز سر پہ آئے آوارہ گردی میں سال گزرا

یہ پڑھائی کا دکھاوا، یہ نوٹس یہ کتابیں
ابا جان کو چکما دینے کے لیے ہیں

"اسے تو تیرا کچا چٹھا سب معلوم ہے قیس!"

مومن میری ناراضی سے ڈرے بغیر برملا بولا۔

غم و غصے سے پاگل ہوتا میں دانت کچکچا رہا تھا۔ "یہ لڑکی ایک بار میرے سامنے آجائے۔" چاروں دوست جن سے کچھ دیر قبل میں بری طرح بدظن ہو رہا تھا وہ سب حق دوستی ادا کرتے ہنسی مذاق اور غیر سنجیدگی برطرف کرتے مکمل سنجیدگی بلکہ کسی قدر غصے سے اس میل کو گھورنے لگے تھے۔

ایک منا ہے دوست ہمارا
سننا اس کا حال
دادی کی آنکھ کا تارا ہے وہ
نانی کا چندا لال

''ورق تمام ہوا اور مئے کی مدح باقی ہے۔'' نوفل نے ایک دم ہی کسی کو بھی آگے پڑھنے کا موقع دیئے بغیر مونیٹر کو ایک زوردار مکا مارا۔

کاشف نے اسے گھورا جو جوشِ جذبات میں یہ بھول چکا تھا کہ یہ اس کے نہیں کاشف کے باپ کی کمائی سے خریدا گیا ہے۔

''کسی کی اتنی جرأت، ہمارے دوست کا مذاق اڑائے۔ قیس تم مجھے اس کا نمبر دو جس سے وہ تمہیں کال کرتی ہے۔ نکلواتا ہوں میں اس کا سارا کچا چٹھا۔ اپنی ایڈوانس اردو کا مظاہرہ بہت کرلیا موصوفہ نے، اب ان محترمہ کو سبق سکھائے جانے کا وقت آچکا ہے۔'' نوفل مکمل جلال میں آچکا تھا۔

''کون سا نمبر دوں؟ ان بیس دنوں میں وہ مجھے بیس مرتبہ کال کرچکی ہے اور ہر بار الگ الگ موبائل نمبروں سے۔'' میں جواباً چڑ کر بولا۔

نوفل میری مدد کرنے کے فل موڈ میں تھا مگر میں غصے اور خوف میں پاؤں پر کلہاڑی نہیں بلکہ کلہاڑی پر پاؤں مار چکا تھا۔ جس طرح انٹرنیٹ پر ''سرفنگ'' اور ''سرچنگ'' کے بعد History ابا جان کے تفتیشی خوف کے پیشِ نظر Delete کرنے کی پکی عادت تھی ایسے ہی کسی لڑکی کی فون کال اٹینڈ کرنے کے بعد نمبر میموری سے Delete کرنے کی۔ غصہ، عقل کا سب سے بڑا دشمن ہے۔ غصے اور جھنجلاہٹ میں ابو کے خوف سے اس ایڈیٹ لڑکی کی فون کالز کے نمبر Delete کرتے وقت بھی دھیان ہی نہ آیا کہ اس ثبوت کو مٹا ڈالا تو اس کا کھوج لگاؤں گا کس طرح؟ شرمندگی سے سر جھکا کر میں نے اپنی حماقت دوستوں کے گوش گزار کی تو وہ سب ساتھ مل کر مجھ پر چلّانے لگے۔

''احمق کی دُم! یہ کیا حرکت کی۔''

''اب کیسے پتا چلے گا اس کا۔''

میں پہلے ہی اپنی بے وقوفی پر شرم اور خجالت میں مبتلا ہو رہا تھا ان سب کی لعن طعن کے بعد شکل مزید رونے والی بن گئی۔ کافی دیر تک وہ سب مل کر مجھے احمقِ اعظم قرار دیتے رہے پھر کاشف ہی کو میری حالت پر رحم آیا۔

''اب بس بھی کرو۔ نمبرز ہی تو مٹے ہیں کوئی دنیا تو ختم نہیں ہوگئی، وہ جب روز فون کرتی ہے تو نمبرز تو دوبارہ جمع کیے جاسکتے ہیں اور پھر سب سے بڑی بات اسے ڈھونڈنے کا یہی ایک واحد طریقہ نہیں۔ صاف ظاہر ہے وہ قیس کی کوئی قریبی جاننے والی ہے۔ قیس تم گھر پر اکیلے بیٹھ کر حالتِ سکون میں اپنی تمام کزنز، تمام پڑوسنوں اور تمام انکلز کی بیٹیوں کے نام اور ان کے حوالے سے اپنے یک لفظی خیالات یعنی چالاک، سیدھی، بھولی، معصوم، لڑاکا، بے وقوف وغیرہ وغیرہ ایک کاغذ پر لکھ ڈالو۔ پھر ہم سب مل کر اس لسٹ میں سے مشکوک لڑکیوں کی ایک الگ فہرست تیار کریں گے اور ہاں یہ یاد رہے کہ اس لسٹ میں ہماری تمام کلاس فیلوز کو شامل کرنا مت بھولنا۔ کسی بھی معاملے کی تفتیش کا بنیادی اور پہلا اصول یہی ہے کہ ہر ایک کو شک کی نگاہ سے دیکھا جائے۔''

''واہ واہ سبحان اللہ، کیا شاندار مشورہ دیا ہے کاشف احمد آپ نے، پہلے سوچو پھر لسٹ بناؤ، پھر اس لسٹ میں سے ایک دوسری لسٹ بناؤ۔ آپ سے پانچ سالہ منصوبہ بنانے کو کہا تھا یا کوئی معقول حل بتانے کو۔ اس عرصہ میں تو وہ اسٹوپڈ نجانے میرے یار کی کتنی درگت بنا چکی ہوگی۔'' نوفل نے طنزیہ لب ولہجہ میں واہ واہ کہتے پہلے تالیاں بجائیں اور پھر اسی طنزیہ لہجے میں یہ جملے کہے۔

تم لوگ کھڑے ہو کر سوچ بچار کرو، میں فوری عمل کا قائل ہوں۔'' زلفی ہم سب کو بحث مباحثہ میں الجھا چھوڑ کر کمپیوٹر کی طرف بڑھا۔

''کیا کر رہے ہو تم؟'' ہم سب نے یک زبان ہو کر پوچھا۔

''اس کی بدتمیزی کا جواب بدتمیزی سے دے رہا ہوں۔ بڑا خود کو شعروسخن کا چیمپین سمجھتی ہے۔ ابھی زلفی کی شاعری نہیں دیکھی۔'' میرے روکنے کے باوجود وہ کرسی سنبھال کر کمپیوٹر کے آگے جم چکا تھا۔

''اکبرالہ آبادی نے ایسی لڑکیوں کے متعلق کافی کچھ کہا ہے، مجھے زیادہ محنت نہیں کرنی پڑے گی۔''

''اکبرالہ آبادی نے یقیناً کافی کچھ کہا ہوگا مگر میرے پیارے، راج دلارے، آنکھوں کے تارے زلفی غصہ جانے دو۔ اگر اس کے بے ہودہ ای میلز کے جواب دینے کا مسئلہ ہوتا تو یہ کام تو کب کا میں خود ہی کر ڈالتا۔ وہ مجھے چڑانا چاہتی ہے، تپانا چاہتی ہے، اسے جواب دوں گا یعنی اسے یہ بتاؤں گا کہ میں بہت چڑ رہا ہوں؟ اس کی خواہش کے عین مطابق چڑ کر میں اسے تسکین دوں کہ وہ مجھے چڑانے اور تپانے میں کامیاب ہو چکی ہے۔''

زلفی میرے سمجھانے پر کمپیوٹر کے سامنے سے اٹھ گیا تھا۔ اب ہم پانچوں دوست کارپٹ پر آڑے ترچھے لیٹے خاموشی سے کوئی معقول طریقہ سوچنے میں گم تھے۔

''پیارے دوستو! اس موقع پر آج کے لیے اتنا غوروفکر کافی ہے۔ یوں بھی ایک ہی بات پر بہت دیر تک سوچنے سے ذہن الجھ جاتا ہے۔ ویسے تو آج یہاں پڑھنے کی خاطر جمع ہوا گیا ہے پر اس بارہ بجاتی رنجیدہ و غصیلی شکل کے ساتھ قیس صاحب نے خاک پڑھائی کرنی ہے۔ لہٰذا مابدولت یہ طے کر رہے ہیں کہ اس موضوع اور پڑھائی دونوں کو کچھ دیر کے لیے موقوف کر کے ٹی وی دیکھ لیا جائے۔''

مومن جیسے پڑھائی کے چور سے اور امید بھی کیا کی جا سکتی تھی۔ کاشف کے گھورنے کے باوجود اس نے ٹی وی آن کر دیا تھا۔

''آواز ہلکی کر خبیث۔'' کاشف نے اس کے ہاتھ سے ریموٹ جھپٹا۔

ایک چینل سے زبردست قسم کا پروگرام آ رہا تھا۔

''لاحول ولاقوۃ۔'' ظاہر ہے یہ بیان ہمارے سب سے نیک اور پارسا دوست مولوی کاشف احمد کا ہی تھا۔ وہ حسیناؤں کے مختصر بلکہ مختصر ترین لباس کو دیکھ کر اپنا ایمان خراب نہیں کرنا چاہتا تھا اس لیے ہم سب کے لیے چائے بنانے چلا گیا جبکہ ہم چاروں ایک مرتبہ پھر میرا کی احمقانہ سنجیدگی، شاندار انگریزی، ثانیہ کے مولویوں کے خلاف اعلانِ جہاد اور ملیکہ کی کھلی ڈلی باتوں کے مزے لینے لگے۔ ان واہیات ای میلز اور پھر اپنی حماقت کے سبب جو میرا موڈ خراب تھا وہ اس ''ایکٹوٹی'' کے بعد از خود ہی خوشگوار ہو گیا تھا۔

☆

آج میرا فراغت کا دن تھا اس لیے ذرا بے فکری سے لمبی تان کو سوتے رہنے کے بعد صبح ساڑھے گیارہ بجے اٹھا، نہا دھو کر کمرے سے باہر نکلا تو شامتِ اعمال پہلی ملاقات والد صاحب سے ہو گئی۔ یا اللہ یہ اس وقت گھر پر کیا کر رہے ہیں؟ میں اندر ہی اندر دہلا پر کمال جرأت کا مظاہرہ کرتے انہیں باادب سلام عرض کیا۔ سلام کا جواب دیتے انہوں نے خوب گھور کر سر سے پاؤں تک مجھے دیکھا پھر طنزیہ لہجے میں گویا ہوئے۔

''اتنی جلدی کیا تھی اٹھنے کی، کچھ دیر اور سو لیتے۔''

''جی بس وہ نیند بھر گئی تھی۔''

عاجزانہ لہجے میں میں سر جھکا کر بولا۔ ڈھٹائی اور بے شرمی کا مظاہرہ کس طرح کیا جاتا ہے یہ ابھی پرسوں رات ہی تو میں نے مومن کی پسندیدہ اداکارہ سے سیکھا تھا۔ میری عاجزی اور نیازمندی نے انہیں طنز اور طعنوں سے براہِ راست غصے کی طرف آنے پر مجبور کر دیا تھا۔ اکلوتی اولاد وہ بھی نانہجار، نالائق، ایک انڈہ وہ بھی گندا جیسے نامناسب اور قابلِ اعتراض الفاظ وہ اپنے فقروں میں استعمال کر رہے تھے۔

''کیا ہو گیا ہے انور! ایک ہی بیٹا ہے کیوں ہر وقت بے چارے کے پیچھے پڑے رہتے ہو۔ مجال ہے جو کبھی شفقت اور محبت سے بیٹے سے بات کی ہو۔'' دادی اماں نے تند لہجے میں بیٹے کی خبر لی۔ ''اب آئے گا مزا۔''

''اکلوتا بیٹا ہے تو کیا سر پر بٹھا لوں، پہلے ہی آپ لوگوں کی دی شہ پر قابو سے باہر ہوا جا رہا ہے۔''

''صبح صبح میرے نواسے کے پیچھے پڑنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ ابھی تو بچے نے ناشتہ بھی نہیں کیا اور تم شروع ہو گئے۔'' نانو ابو پر بگڑیں۔

''یہ صبح صبح ہے؟ بڑی امی دوپہر کے بارہ بج رہے ہیں۔'' ابو، دادی اماں اور نانو کو آپس میں الجھتا چھوڑ کر میں ڈائننگ ٹیبل پر آ گیا جہاں امی میرے لیے میری پسند کا گرما گرم ناشتہ لیے موجود تھیں۔ میں اپنے آگے رکھے بہترین ناشتے سے لطف اندوز ہونے لگا تھا۔

''آج فراغت ملی ہے تو اچھے بچوں کی طرح دل لگا کر اور خوب جم کر پڑھائی کرنی چاہیے۔''

اس نیک خیال پر عمل درآمد کرتے میں ٹائم ٹیبل بنانے لگا، دن بھر کیا کیا پڑھنا ہے اور کتنی کتنی دیر پڑھنا ہے ابھی یہ کام بھی نہیں ہونے پایا تھا کہ امی کی خالہ زاد بہن حبیبہ خالہ اور ان کی بیٹی حور العین ہمارے گھر تشریف لے آئیں۔ حور العین جسے سب پیار سے حور کہتے تھے اور بالکل بجا کہتے تھے اس کے ساتھ میرا تعلق ذرا قدیم ہے۔

نوعمری کے زمانے کی پہلی محبت جسے اب میں Puppy love قرار دے کر مسکرا دیتا ہوں۔ تیرہ سال کی عمر میں جب مجھے خود سے تین سال بڑی اپنی کزن اچانک ہی بہت اچھی لگنے لگی تھی۔ تب لگتا تھا کہ اگر حور مجھے نہ ملی تو میں زہر کھا کر خودکشی کر لوں گا۔ وہ پڑھائی میں بڑی اچھی تھی اور میں نالائق۔ پڑھائی کے ساتھ وہ غیر نصابی سرگرمیوں میں بھی کارہائے نمایاں سرانجام دیا کرتی تھی۔ وہ ان دنوں فرسٹ ایئر پری میڈیکل کی اسٹوڈنٹ تھی جب میں اس سے مدد لینے اس کے گھر چلا جایا کرتا تھا۔ اس کا گھر ہمارے گھر سے قریب تھا اور میں اپنی اسپورٹس بائی سائیکل ہوا کے دوش پر اڑاتا ہر دوسرے روز اس کے گھر پہنچ جایا کرتا تھا۔ میں اس کے عشق میں گوڈوں گوڈوں ڈوب چکا تھا اور وہ تھی کہ کچھ سمجھتی ہی نہ تھی۔

تب ایک روز ہمت کر کے میں نے ایک سرخ گلاب کا پھول (جو اسی کے لان سے توڑا تھا) اس کی طرف بڑھا کر اسے ''حور! آئی لو یو'' بول دیا تھا۔ اس کا ردِعمل بڑا ہتک آمیز تھا۔ پہلے وہ حیران ہوئی پھر زور زور سے ہنسنے لگی۔

''منے! پہلے بڑے تو ہو جاؤ۔''

''میں بڑا ہو چکا ہوں، پورے تیرہ سال اور چار ماہ کا۔''

''ہاں واقعی بہت بڑے ہو چکے، پر جتنے بھی بڑے ہو جاؤ مجھ سے ہمیشہ تین سال چھوٹے رہو گے۔''

''اس سے کیا فرق پڑتا ہے؟''میں اس کی مذاق اڑاتی نگاہوں کے باوجود جرأت سے بولا۔

''اس سے بہت فرق پڑتا ہے اور چلو اگر میں یہ مان بھی لوں کہ اس سے فرق نہیں پڑتا تب بھی میرا آئیڈیل کوئی نکما، نالائق اور ڈفر لڑکا تو ہر گز نہیں ہے۔ میں ڈاکٹر بنوں گی اور کسی ڈاکٹر ہی سے شادی کروں گی اور پڑھائی میں تم جتنے نکمے ہوا سے دیکھ کر یہ سوچا ہی نہیں جا سکتا کہ تم کبھی ڈاکٹر بن سکو گے۔''

اپنی پہلی پہلی معصومانہ سی عاشقی میں عزتِ سادات گنوا کر میں اپنا سا منہ لے کر وہاں سے لوٹ آیا تھا۔ حور العین نے میرے اظہارِ محبت کی جیسی دھجیاں بکھیری تھیں اس پر میں کئی دنوں تک سوگوار اور مغموم رہا تھا۔ ایک طویل عرصہ تک میں اپنی محبت کی ناقدری اور اپنی ذلت و رسوائی پر اس سے سخت ناراض بھی رہا تھا۔

''سمجھتی کیا ہے خود کو؟ مجھے نکما، نالائق کہتی ہے۔''

ابو کی ڈانٹ ڈپٹ مجھے پڑھائی لکھائی کے معاملے میں اتنا نہیں سدھار سکی تھی جتنا ایک لڑکی کے توہین آمیز جملوں نے میری مردانہ غیرت کو للکارا تھا۔ تب یہ جنون سا دل میں بھر گیا تھا کہ اب میں اسے کسی قابل بن کر ہی دکھاؤں گا۔ ڈاکٹر بننا کوئی ایسا مشکل کام نہیں۔ یہاں تک کہ ایم بی بی ایس کی جگہ بی ڈی ایس کرنے کا فیصلہ بھی صرف اسے نیچا دکھانے کو، اس کے غرور کا سر جھکانے کو کیا تھا۔ وہ بی ڈی ایس کر سکتی ہے تو کیا میں نہیں؟ خیر یہ قصہ ہے جب کا کہ قیس نادان تھا۔ تیرہ سال کی عمر میں میں واقعی بچہ تھا۔ ذرا بڑا ہوا اور آنکھیں کھلیں تو پتا چلا میرے اردگرد ''حوروں'' اور ''پریوں'' کا ایک جہان آباد ہے اور ان حوروں کے آگے یہ ''حور'' تو کچھ بھی نہیں۔ تب اپنے Puppy Love پر ہنستے میں نے حور کے خلاف دل میں بھرا سارا بغض و عناد نکال دیا تھا۔

ہم ایک ہی کالج میں تھے وہ سینئر، میں جونیئر۔ میری اس سے خود ساختہ ناراضی ختم ہوئی تو خود بخود ہی ہم اچھے دوست بن گئے۔ دوستی اور رشتہ داری کی لاج رکھتے ہوئے وہ اپنی کتابوں اور نوٹس سے مجھے فیض یاب ہونے کا پورا پورا موقع فراہم کیا کرتی تھی۔ حور نے کبھی بچپن کے اس واقعہ کا حوالہ نہ دیا تھا مجھے لگتا تھا شاید وہ اس پرانی بات کو بھول ہی چکی ہے۔ یہ اس کا کالج میں آخری سال بلکہ چند آخری ماہ تھے، وہ عنقریب وہاں سے پاس آؤٹ کر جانے والی تھی۔

''آؤ منے میاں! اور سناؤ کیسے ہو؟ ابھی میں نانو سے تمہارا ہی پوچھ رہی تھی۔'' وہ مجھے دیکھ کر شرارتی سے انداز میں مسکرائی۔ امی، نانو اور حبیبہ خالہ اس کی بات پر مسکرائی تھیں جبکہ منے میاں کا لفظ سنتے ہی میرا موڈ آف ہو گیا تھا۔ سوچتے، غور کرتے میں بظاہر مسکرایا، ایسی بھرپور مسکراہٹ جو اسے میرے چڑنے کا پتا ہی نہ دے سکے۔

''سنا ہے حور! کسی ڈاکٹر مسلم کو ملنے والی ہے۔'' دوستانہ انداز میں مسکراتے میں نے لفظ حور اسی انداز میں کہا جیسے ابھی اس نے منے میاں کہا تھا۔

''حوروں کا وعدہ کیا ہی مسلمانوں سے گیا ہے، ظاہر ہے جو نیک اعمال کرے گا حور اسی کو ملے گی۔''

وہ کھلکھلاتے ہوئے شرارتی انداز میں بولی۔ ایسی پٹاخہ لڑکیاں جن کے پاس ہر بات کا گھڑا گھڑایا جواب موجود ہو مجھے ذرا نہیں بھاتیں۔ حور سے گو اب میرے دوستانہ مراسم تھے مگر اس وقت میں اس سے کچھ چڑ بھی رہا تھا اور کچھ مشکوک بھی ہونے لگا تھا۔

ابھی دل ہی دل میں حور سے چڑتے اور مشکوک ہوتے کچھ زیادہ دیر نہ گزری تھی کہ حور کے بڑے بھائی صاحب جنید ظہیر بھی ہمارے گھر تشریف لے آئے۔ یہ جنید ظہیر ذرا پڑھا کو قسم کے پروفیسر ٹائپ بندے ہیں۔ ان کا اٹھنا، بیٹھنا، سونا، جاگنا سب کچھ Mathematics ہے۔ وہ Calculus (کیلکولس) کے مختلف فارمولوں پر غور کرتے رات کو سوتے اور صبح جیومیٹری کے کسی پیچیدہ مسئلے کا حل دریافت کرتے اٹھتے ہیں۔ خیر سے ایم فل کر چکے ہیں NED میں درس و تدریس کے فرائض انجام دے رہے ہیں اور عنقریب ان کا پی ایچ ڈی کے لیے امریکہ روانگی کا ارادہ ہے۔

میرا ذاتی نظریہ ہے کہ بندہ بس اتنی تعلیم حاصل کرلے کہ معاشرے میں باعزت زندگی گزار سکے۔ اچھا کھا کما سکے۔ اب یہ کیا کہ کوئی ایک مضمون پکڑلو اور پھر ریسرچ کے نام پر ڈنڈا لے کر اس کے پیچھے ہی پڑ جاؤ اور یہ Phd کرتے کرتے تو مجھے لگتا ہے اچھا خاصا نارمل بندہ بھی یقیناً پاگل ہی ہو جایا کرتا ہوگا۔

میں جنید کے لیے جس بھی قسم کے خیالات رکھتا پر وہ ابو کا بہت فیوریٹ ہے۔ محنتی، ذہین، قابل، جینئس۔ وہ اسے نجانے کون کون سے خطابات سے نوازتے ایک طنزیہ نگاہ مجھ پر ضرور ڈالا کرتے ہیں۔

میرے ساتھ ساتھ امی، نانو اور دادی اماں نے بھی جنید کو قدرے تعجب سے دیکھا۔ کتابوں میں کھویا رہنے والا وہ بندہ اپنے گھر والوں سے بمشکل ملا کرتا تھا۔ ایک طویل عرصہ بعد کل شام وہ ہمارے گھر آئے تھے۔ غالباً اپنی امریکہ روانگی کے حوالے سے اسے ابو سے کوئی کام تھا۔ امی نے انہیں کھانے پر روک لیا تھا، رات کھانے کے بعد وہ ہمارے گھر سے گئے تو مجھے یقین تھا کہ اب دو تین سال سے پہلے ان کی شکل دوبارہ نظر نہیں آئے گی مگر حیرانی اور تعجب کی بات یہ تھی کہ وہ اگلے ہی دن یعنی آج پھر ہمارے گھر پر موجود تھے۔

میری چھٹی حس نے مجھے اطلاع دی کہ پروفیسر صاحب کی یہ روز روز کی آمد بے مقصد نہیں ہو سکتی ابھی میں غور خوض کر بھی نہ پایا تھا کہ حبیبہ خالہ وغیرہ کے چلے جانے کے بعد رات کھانے پر امی نے یہ عقدہ حل کیا کہ حبیبہ خالہ اور حور دراصل آج جنید کے لیے ہماری پڑوسن ایمان جاوید کے ساتھ رشتے کے سلسلے میں بات کرنے آئی تھیں۔ وہ امی کے ساتھ ان کے گھر جنید کا رشتہ لے جانا چاہتی تھیں۔ کل ہمارے گھر آمد پر جنید صاحب کو امی سے دہلی بریانی، سندھی بریانی، بمبئی بریانی اور حیدر آبادی بریانی کی تراکیب پوچھتی ایمان جاوید اس قدر بھائی تھی کہ انہوں نے اگلے ہی روز اپنی والدہ اور بہن کو ہمارے گھر روانہ کر دیا تھا۔ Zerro اور Infinity کے چکروں میں ہمہ وقت الجھے رہنے والے پروفیسر صاحب ''ایسی'' سرگرمیوں میں بھی انوالو ہو سکتے ہیں۔

میں حیرت سے گنگ تھا۔ کل ہمارے گھر اتنا طویل قیام امی کے اصرار کے سبب نہیں بلکہ کسی اور ہی وجہ سے تھا۔ بظاہر کھوئے کھوئے دنیا جہان سے بے نیاز نظر آنے والے یہ پروفیسر صاحب اندر سے خاصے حسن پرست اور عاشق مزاج ثابت ہوئے تھے جہاں تک ایمان کے لیے جنید

کے رشتے کا سوال تھا تو اس پر مجھے کوئی اعتراض تھا نہ پریشانی۔ وہ شروع شروع کی بات تھی جب میں ''باجی'' کے حسن سے متاثر ہو گیا تھا۔ اب ان پردہ نشین باجی سے میں بری طرح بور ہو چکا تھا۔

اپنے ہی گھر کے کچن، لاؤنج یا ڈائننگ روم میں میں ان کی موجودگی میں کسی ضرورت کے تحت چلا جاتا تو جھٹ ادھر ادھر منہ چھپانے کی یوں کوشش کرتیں جیسے میں کوئی اچکا اور لفنگا تھا اور امی بعد میں ''پتا بھی ہے وہ پردہ کرتی ہے پھر اس طرح منہ اٹھا کر کیوں گھسے۔'' کہہ کر مجھے ڈانٹا کرتیں۔

اپنے ہی گھر میں بندہ آزادی سے گھوم پھر بھی نہ سکے۔ صرف باجی ہی سے کیا میں اب پڑوس مقیم اس پوری فیملی ہی سے بری طرح چڑنے لگا تھا۔ یہ فیملی ہمارے لیے ایسٹ انڈیا کمپنی جیسی ثابت ہو رہی تھی۔ ابتداء میں پڑھائی کے بہانے ہمارے گھر میں داخل ہو کر ان لوگوں نے آہستہ آہستہ اپنے قدم یہاں جما لیے تھے۔

چھوٹی بہنوں کے بعد دبے پاؤں بڑی بہن صاحبہ کی آمد شروع ہوئی۔ سلائی، کٹائی، بُنائی، پکائی سیکھنے کے لیے۔ جب پوتیوں نے ہمارے گھر کی تمام خواتین کے دلوں میں گھر کر لیا تو دادی صاحبہ کی ہمارے گھر بے تکلف آمد و رفت شروع ہوئی۔ پوری کی پوری فیملی کنجوس مکھی چوس اور مفت خوری تھی۔ کنجوس دادی کو پڑوس ہی میں مفت کا ای این ٹی اسپیشلسٹ اور ڈینٹسٹ ہاتھ لگ گیا تو انہیں مزے آ گئے۔

میرے گھر کی تینوں خواتین اس خاندان کی والہ وشیدا تھیں، میری سمجھ میں نہ آتا تھا کہ ایسی کیا ترکیب لڑاؤں جس سے اس فیملی کا ہمارے گھر میں بے تحاشا آمد و رفت اور مفت خوری کا سلسلہ اختتام پذیر ہو۔ سو اپنے گھر صبح شام بن بلائے مہمان کی طرح نازل ہونے والی ایک حسینہ کا رشتہ اپنے کزن سے طے ہو جانے پر مجھے کیا پریشانی لاحق ہو سکتی تھی۔ ہاں البتہ میں اس بات پر ضرور حیران ہو رہا تھا کہ کہاں جنید جیسا عالم فاضل اور کتابی کیڑا ٹائپ بندہ اور کہاں کشیدہ کاری اور گھر داری کی شوقین میری پڑوسن جن کا علمی و تعلیمی ریکارڈ خاصا زبوں حالی کا شکار تھا۔ میں اس زبوں حالی سے کافی عرصے سے آگاہ تھا۔ یہ آگاہی دراصل مجھے اس روز حاصل ہوئی تھی جب ایک روز دونوں چھوٹی بہنوں کے ساتھ ساتھ امی بڑی بہن صاحبہ کو بھی پڑھاتی نظر آئی تھیں۔ وہ آئیں تو امی سے کچھ پکانا سیکھنے کے لیے تھیں مگر امی نے انہیں پڑھنے بٹھا لیا تھا۔

''بیٹا! تم تکلف بہت کرتی ہو۔ تم لوگوں کو پڑھانے میں میرا بالکل وقت ضائع نہیں ہوتا۔ جس وقت میں سجدہ اور حیا کو پڑھاتی ہوں تم بھی کچھ پوچھنا یا سمجھنا ہو تو بے جھجک آ جایا کرو۔''

''آنٹی! آپ کو تکلیف ہوگی، زحمت ہوگی۔'' جیسے وہ فقرے کچھ دیر بولتی رہی لیکن امی کے پرزور اور پرخلوص اصرار پر اسے اپنے گھر سے اپنی کتابیں اور رجسٹرز وغیرہ اٹھا کر لانے ہی پڑے۔ میں برابر والے کمرے میں بیٹھا کمپیوٹر پر اپنا کام بھی کر رہا تھا اور اس طرف کا یہ منظر بھی درمیانی کھڑکی کھلی ہونے کے سبب دیکھا جا رہا تھا۔

یہ ان دنوں کی بات تھی جب میں ''باجی'' کے حسن سے شدید متاثر تھا اور اس وقت تک مجھے اپنے گھر پر غیر محسوس انداز میں قابض ہوتی اس فیملی سے کوئی پرخاش نہ ہوئی تھی۔ امی کچھ دیر اس سے اس کے بی اے کے مضامین پر گفتگو کرتی رہیں۔ پھر کتابیں کھولی گئیں، امی اسے ہسٹری پڑھا رہی تھیں۔ میں جہاں اپنی امی کی قابلیت اور علم سے بے تحاشا متاثر اور خوش ہو رہا تھا وہیں یہ دیکھ کر شدید حیران بھی ہو رہا تھا کہ کچھ منٹ پہلے

اچھی خاصی چاق و چوبند اور فریش نظر آنے والی "باجی" فقط دس پندرہ منٹ کی پڑھائی کے بعد ہی بے حد تھکی ہوئی نظر آنے لگی تھیں۔ آنکھیں نیند کے بوجھ سے بند ہوئی جا رہی تھیں۔ ہر اگلے سیکنڈ منہ پر ہاتھ رکھ کر جمائی روکی جا رہی تھی۔ پہلی اور دوسری جنگِ عظیم کے تاریخی پس منظر بیان کرتے امی جرمنی کی تاریخ، ہٹلر کے مظالم، نازیوں کی دہشت گردی سے ہوتے ہوتے آئن اسٹائن تک پہنچیں کہ کس طرح نازیوں کے مظالم کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرتے اس نے اپنا ملک جرمنی چھوڑ دیا تھا۔ وہ آزادیٔ ضمیر کا قائل تھا۔ اس کا نظریۂ اضافیت، کوئی معمولی کارنامہ نہیں تھا مگر اپنے ہی ملک میں اس کی وہ قدر نہ ہوئی جو ہونی چاہیے تھی۔ اسے غداری کے طعنے دیئے گئے، اس کے ساتھ تعصب برتا گیا۔

امی بڑے خوبصورت لب ولہجے میں اسے مفید معلومات فراہم کر رہی تھیں جب محترمہ نے جمائی روکتے نیند میں ڈوبی آواز میں پوچھا۔

"آنٹی! یہ آئن اسٹائن کیا کوئی رائٹر یا سوشل ورکر ہیں؟"

اس معصومانہ سوال کے بعد امی کا غالباً اپنا سر پیٹنے کو دل چاہا ہوگا اور رہا میں تو مجھے اسی ایک جملے سے اس بیوٹی کوئن کے پاس برین کی غیر موجودگی کی اطلاع مل گئی تھی۔

پوچھتے ہیں وہ کہ "آئن اسٹائن" کون ہے؟
کوئی بتلاؤ کہ ہم بتلائیں کیا؟

میں نے اگلے روز آئن اسٹائن کی اس "عزت افزائی" کا تذکرہ اپنے دوستوں سے کیا تو زلفی نے اس پر شعری تبصرہ برملا کیا تھا۔ مزید کچھ دیر اور باجی کو پڑھانے کی کوشش بمشکل جاری رکھنے کے بعد امی ان کی "ذہنی سطح" کے آگے جلد ہی ہار مان گئی تھیں۔ تھوڑی دیر بعد جب میں کمپیوٹر کے سامنے سے اٹھ کر کچن میں پانی پینے آیا تو کیا دیکھتا ہوں کہ کچھ دیر قبل جو خاتون کتابیں اور نوٹس سامنے پھیلائے لمبی لمبی جمائیاں لے رہی تھیں، آنکھیں جن کی نیند کے بوجھ سے بند ہوئی جاتی تھیں اب بالکل فریش اور چاق و چوبند امی سے یخنی پلاؤ، زعفرانی پلاؤ، موتی پلاؤ اور خدا جانے کون کون سی قسموں کے پلاؤ پکانا سیکھ رہی تھیں۔

یہ نظارہ دیکھتے ہی مجھے یقین ہو گیا تھا کہ یہ محترمہ دھکے و کے کھاتی بی اے پارٹ ون تک تو جیسے تیسے پہنچ گئی ہیں مگر آگے ان تلوں میں تیل نہیں، اس پہلی اور آخری کوشش کے بعد امی نے آئندہ کبھی باجی کو پڑھانے کی ہمت نہ کی۔ اپنی طرح کی پڑھائی سے جی چرانے والی تمام لڑکیوں کی طرح باجی خیر سے شادی کی ازحد شوقین تھیں۔ اس کا اندازہ مجھے ایک روز ان کے گھر جانے پر ہوا جہاں وہ میری آمد سے بے خبر اپنی چند سہیلیوں کے ساتھ لان میں بیٹھی گپ شپ کر رہی تھیں۔

"ایمان کا تو لگتا ہے بی اے سے پہلے ہی بیاہ کا پروگرام ہے۔"

"تمہارے منہ میں گھی شکر، ہائے کاش ایسا ہو جائے۔ سچی یہ پڑھائی وڑھائی ہم سے تو نہیں ہوتی اور پھر زیادہ پڑھ لکھ کر ہم لڑکیوں نے کون سا نشی گیری کرنی ہے۔ میاں جی اور بچوں کو سنبھالنے کے لیے انٹر تک کی تعلیم بہت کافی ہے۔" اپنی سہیلی کی بات کا جواب باجی نے بہت حسرت اور شدت سے دیا تھا۔ ماضی قریب کے ان واقعات کا چشم دید گواہ ہونے کے سبب میں یہ ضرور سوچ رہا تھا کہ جو آئن اسٹائن کے لیے سوشل ورکر اور

رائٹر کے الفاظ استعمال کرے وہ بھی فعل حال، ہیں کے ساتھ اور جو پڑھائی لکھائی کو وبالِ جان سمجھتی ہو اس کی اور پروفیسر صاحب کی نبھے گی کیسے؟ ان محترمہ کے تو سر کے کئی فٹ اوپر سے گزر جایا کریں گی ہمارے پروفیسر صاحب کی ریاضی کے اصولوں اور قاعدوں پر مشتمل پیچیدہ پیچیدہ باتیں۔

خیر کسی کی منگنی کسی کے بھی ساتھ ہو مجھے اس سے کیا غرض لیکن نہیں جناب مجھے اس سے غرض ہے ناں۔ وجہ وہی میری والدہ ماجدہ، دادی اماں اور نانو اور ان تینوں کا پڑوسیوں کی طرف ضرورت سے بڑھا التفات۔ منگنی برابر والے گھر میں تھی اور آفت ہمارے گھر میں آئی ہوئی تھی۔ ہماری گاڑی پیٹرول سے نہیں پانی سے چلتی تھی اور میں مفت کا ڈرائیور خدمت کو حاضر تھا۔ بچیوں کے بھائی کام کو سنتے کہاں تھے اور رہے ان کے چاچے مامے تو وہ مصروف بہت رہتے تھے، فارغ اور بے کار تو بس ایک میں ہی تھا سارے جہان میں۔

امی کی ان تاویلوں میں جتنا جل کُڑھ سکتا تھا جلتا اور کُڑھتا تھا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے ہمارے اپنے گھر میں کوئی تقریب ہونے والی ہے۔ ادھر دادی جان نے مظلومیت بھرے لہجے میں ذکر کیا کہ ان کے گھر کا لان چھوٹا بھی ہے اور اس کی حالت بھی ایسی نہیں کہ وہاں کوئی تقریب منعقد کی جا سکے، ادھر دادی اماں اور نانو نے جھٹ انہیں تقریب کے انعقاد کے لیے اپنا لان پیش کر دیا۔ اس پیشکش سے انکار کیوں ہوتا یہ ذکر کیا ہی اسی لیے گیا تھا۔ امی، دادی اماں اور نانو کی مہربانیوں کے سبب وہ مشہورِ زمانہ منگنی کی تقریب ہمارے لان میں منعقد کی گئی۔

اس ساری صورتِ حال سے میں کس قدر خار کھا رہا تھا بیان سے باہر ہے۔ اس ایسٹ انڈیا کمپنی کو کس طرح اپنے گھر سے مار بھگاؤں کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ تین چار دن اسی آفت و ہنگامے کی نذر ہو گئے۔ منگنی تو چٹ ہو ہی گئی تھی، تازہ ترین اطلاعات یہ تھیں کہ بیاہ بھی پٹ ہو جائے گا یعنی جنید کی امریکہ روانگی سے قبل۔ ان دنوں ڈگری کلاسز کے امتحانات کا سیزن چل رہا تھا اور میری پڑوسن، دنوا دنوا میں گنوں کا مجسم اشتہار بنی امتحانات کا نہیں شادی کا دن گن گن کر بے چینی سے انتظار کرتی نظر آ رہی تھیں۔

جب شادی کی تیاریوں کے سلسلے میں وہ ان کی دادی جان اور تازہ ترین انٹری، ان کی والدہ محترمہ اکثر و بیشتر ہمارے ہی گھر میں پائی جاتی تھیں تو پھر یہ ''انتظاری'' کیفیت میری زیرک نگاہوں سے کیونکر مخفی رہ سکتی تھی۔

☆

پڑوس میں ہونے والی منگنی کی دردسری سے نجات ملی تو آج میرا اپنے کئی روز سے التواء میں پڑے کام نمٹانے کا ارادہ تھا جن میں سرِفہرست اردو بازار سے کچھ کتابوں وغیرہ کی خریداری کے لیے جانا تھا۔ سیٹی پر اپنے ایک پسندیدہ گانے۔

''آوارگی میں حد سے گزر جانا چاہیے۔''

کی دھن بجاتا میں تولیے سے سر رگڑتا ہوا باتھ روم سے نکلا۔ گیلا تولیہ کرسی پر اچھال کر ابھی میں نے بال بنانے کے لیے برش اٹھایا ہی تھا کہ ادھ کھلے دروازے سے نازو بیگم نے اندر جھانکا۔ ''مُن'' آدھا لفظ بولتے ہی اس نے زبان دانتوں تلے دبائی پھر تیزی سے بولی۔

''بھائی! آپ اردو بازار جا رہے ہیں؟''

''ہاں تو پھر؟''

میں صبح ناشتے کے وقت امی کو اپنے آج دن بھر کے تمام معمولات سے آگاہ کر رہا تھا تب شاید اس نے میرے اردو بازار جانے کا سن لیا ہوگا۔

''انہیں کچھ کتابیں بہت ضروری چاہئیں، آس پاس کی دکانوں پر نہیں مل رہیں، پریشان ہو رہی تھیں بے چاری، میں نے سوچا آپ کتابیں لینے ہی تو جا رہے ہیں اگر ان بے چاری کی کتابیں بھی۔'' بے چاری کا لفظ جملے میں کئی مرتبہ بے دریغ استعمال کرتے اپنی بات مکمل کر لینے کے بعد اب ناز و صاحبہ مٹھی میں دبا ایک کاغذ کھولتی...... میری طرف بڑھائے کھڑی تھیں۔

''یہ کیا ہے؟'' میرا پارہ ہائی ہو رہا تھا۔

''یہ کتابوں کی لسٹ ہے بھائی! نشو باجی سے میں نے کہا کہ قیس بھائی آپ کی کتابیں بھی لے آئیں گے۔''

اس ڈرے ڈرے معصومانہ انداز پر میرا دل چاہا اس کا سر پھاڑ دوں۔

''مجھ سے پوچھے بغیر آپ نے وعدہ بھی کر لیا اور لسٹ بھی لیے چلی آئیں۔ سمجھ کیا رکھا ہے تم نے مجھے، کون ہوں میں؟ نوکر ہوں تمہارا یا تمہاری نشو باجی کا۔'' غصے سے چلاّتے میری اچانک ہی جو اس کے ہاتھ میں موجود کاغذ کی فہرست پر نگاہ پڑی تو میں یک لخت ہی خاموش ہو گیا۔

''مقدمہ شعر و شاعری، موازنہ انیس و دبیر، لکھنؤ کا دبستانِ شاعری۔''

''اپنی ایڈوانس اردو کا مظاہرہ بہت کر لیا محترمہ نے۔''

''بڑا خود کو شعر و سخن کا چیمپئن سمجھتی ہے۔'' میری سماعتوں میں نوفل اور زلفی کی آوازیں گونجیں۔

''لاؤ یہ لسٹ مجھے دے دو۔ نشو باجی سے کہنا فکر نہ کریں، میں ساری کتابیں لا دوں گا۔''

نازو جو میرے چیخنے چلاّنے پر بری طرح ڈر کر سہمی ہوئی کھڑی تھی۔ میرے ایک دم ہی پینترا بدلنے پر ہکا بکا رہ گئی۔ کہاں چیخ و پکار اور کہاں یہ شہد میں ڈوبا لہجہ؟

میں نے اس کے ہاتھ سے لسٹ لے کر اسے کمرے سے رخصت کیا اور اب اس لسٹ کو گھور گھور کر دیکھ رہا تھا۔ یہ نازو کی بچی، مارِ آستین، گھر کی بھیدی۔ میرے گھر کی اتنی خفیہ اور نجی باتیں باہر کس طرح پہنچ رہی تھیں مجھے سمجھ میں آ رہا تھا۔ اپنی بے تحاشا اور بے وقوفانہ حد تک سوچے سمجھے بغیر بولنے کی عادت یہ جاہل کبھی چھوڑ ہی نہیں سکتی تھی۔ اپنی بے وقوفی میں وہ میرے بارے میں اپنی نشو باجی کو کس طرح لمحہ لمحہ کی خبریں پہنچا رہی تھی اس کا جیتا جاگتا ثبوت تو یہ لسٹ تھی۔

میں اردو بازار ابھی گیا بھی نہیں اور سارے محلے کو اس کی خبر ہو گئی۔ تو یہ سب یوں تھا کہ اس چالاک لڑکی کو میرے آنے جانے کے اوقات اور باقی سب کچھ اس گھر کی بھیدی کے ذریعے پتا چل رہا تھا۔ یہ ایڈوانس اردو کی طالبہ نشو بیگم، انہیں میں نے سبق نہ سکھایا تو قیس انور حسین نام نہیں۔ فقط چھ روز پہلے میں حور پر مشکوک ہو رہا تھا۔ وہ تو اس منگنی کے بکھیڑے نے فرصت نہ دی ورنہ اب تک میں اپنے شکوک کو کنفرم کرنے کے لیے کوئی نہ کوئی عملی قدم بھی ضروری اٹھا چکا ہوتا۔

ابھی میں کھڑا اس لسٹ کو گھور ہی رہا تھا کہ میرا موبائل بجا۔ میں نے موبائل اٹھا کر دیکھا تو مولوی کاشف کا لنگ لکھا نظر آیا۔ غصے میں تو

اس وقت میں تھا ہی چنانچہ لٹھ مار انداز میں ''ہیلو'' کہا۔

''آپ کے بیٹے نے پاپا کہا۔'' کچھ اٹھلاتے ہوئے شوخ انداز میں وہ بولا۔

''کیا بکواس ہے یہ؟'' ٹی وی پر چلنے والے اشتہارات سے جتنی خار میں کھانے لگا تھا، ایسے میں یہ جملہ مجھے جلا کر راکھ کر گیا۔

''یار! ناراض کیوں ہوتا ہے۔ میں تو تیرا موڈ ٹھیک کرنے کو مذاق کر رہا تھا۔ دراصل تو اس وقت میں نے بڑے ضروری کام سے تجھے فون کیا ہے۔''

میں نے جواب میں صرف ''ہوں'' کہنے پر اکتفا کیا تو وہ پرجوش سے انداز میں جلدی سے بولا۔

''قیس! میرے یار تو جلدی سے میری طرف چلا آ۔ تیری مجرم کو تیرے سامنے لانے کی ایک بڑی زبردست ترکیب میرے ذہن میں ابھی ابھی آئی ہے۔''

''تمہاری ترکیبیں اور تمہاری لانگ ٹرم پلاننگز سب بوگس ہیں، میں ان کے بغیر ہی اصلی مجرم تک پہنچ چکا ہوں۔ تم بیٹھ کر ترکیبیں سوچو میں اس بے ہودہ لڑکی کی بے ہودگیوں کا انجام کرنے جا رہا ہوں۔'' اس کا جواب سنے بغیر میں نے فون بند کر دیا۔ میرا انتقامی جذبہ اپنے عروج پر تھا۔

''قیس! تم سے صبح سے کہہ رہی ہوں بیگ صاحب کی امی کو دیکھ آؤ۔ کتنی مرتبہ فون کر کے تمہارا پوچھ چکی ہیں۔ پتا نہیں کس اناڑی ڈاکٹر سے داڑھ نکلوا کر آئی ہیں، تکلیف ہے کہ بجائے کم ہونے کے بڑھتی ہی چلی جا رہی ہے۔'' امی میرے کمرے میں آ کر ذرا خفگی سے اور کچھ حکمیہ انداز میں بولیں۔

''اناڑی ڈاکٹر نے داڑھ صحیح نہیں نکالی اور میں تو جیسے بہت ماہر اور قابل ہوں۔ پیسے بچ جائیں کسی طرح۔ پڑوس میں چند بے وقوف رہتے ہیں۔ ان بے وقوفوں میں سے ایک آ کر مفت دیکھ بھی لے گا، دوا بھی بتا دے گا بلکہ اگر اس کے گھر پر پڑی ہوئی تو مفت دے بھی دے گا۔'' میں نے چڑ کر امی کو جواب دیا۔

''بری بات ہے بیٹا! دوسروں کے کام آؤ تو۔''

''جی مجھے آپ کا سکھایا سبق یاد ہے۔ ہم اس دنیا میں دوسروں کی خدمت کے لیے آئے ہیں اور دوسرے ہم سے خدمت لینے کے لیے۔''

ناراضی سے بولتا میں کمرے سے باہر نکل آیا۔ مجھ نیم حکیم اور اناڑی کے حوالے اگر وہ اپنی بتیسی کرنا ہی چاہ رہی ہیں تو میرا کیا جاتا ہے۔ اپنے گیٹ سے نکل کر میں سیدھا برابر والے گیٹ میں گھسا۔ اس مچھلی بازار کا گیٹ ہمہ وقت چوپٹ کھلا رہتا ہے۔ دن دہاڑے چوریاں ہو رہی ہیں، ڈاکے پڑ رہے ہیں، شہر کے ان سب حالات سے اس جنجال پورے کے مکینوں کو کوئی سروکار نہ تھا۔

جتنے گھر میں افراد ہیں اتنے ہی افراد ہر وقت مہمانوں کی صورت میں اس گھر میں موجود رہتے تھے۔ اس رش اور بھگدڑ میں آپ کون ہیں، کس لیے آئے ہیں اور کس سے ملنے آئے ہیں یہ جاننے کی کسی کے پاس فرصت نہیں ہوتی۔ یہاں آنے والے اپنی مدد آپ کے تحت اپنی مطلوبہ شخصیات کو باقاعدہ ڈھونڈ کر پھر ان سے شرف ملاقات حاصل کیا کرتے ہیں۔

میں بھی بچتا بچاتا دادی محترمہ کے کمرے تک بالآخر پہنچ گیا۔ یہ کمرہ چونکہ گھر کے بالکل شروع کے حصے میں ہے اس لیے مجھے زیادہ مشقت نہیں کرنی پڑی تھی۔ ایک تو یہ دادی جان سنتی اس قدر اونچا تھیں، میں بولتا کچھ تھا اور وہ سمجھتی کچھ تھیں۔

ان کے کمرے کا دروازہ کھلا ہوا ہی تھا میں گلا کھنکار کر اندر داخل ہونا ہی چاہتا تھا کہ ان کے کمرے میں صوفے پر سر جوڑ کر بیٹھی ایمان، سجدہ اور حیا پر میری نظر پڑی۔ ان کی دادی بیڈ پر کمبل سر تک اوڑھے غالباً سو رہی تھیں اور وہ تینوں کمرے کے دوسرے کونے میں دھرے صوفے پر براجمان تھیں۔ ان تینوں کی میری طرف پیٹھ تھی۔ قبل اس کے کہ شائستگی و تہذیب کا مظاہرہ کرتا، میں انہیں اپنی موجودگی سے آگاہ کر پاتا میرے کانوں میں باجی صاحبہ کی آواز گونجی جو بہت بدلی ہوئی اور بہت باریک سی تھی۔

''ہیلو جی مجھے قیس صاحب سے بات کرنی ہے۔''

میں جہاں تھا وہیں کا وہیں کھڑا رہ گیا۔ مجھے اپنے کانوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ زمین آسمان سب اپنی جگہ سے ہلتے محسوس ہو رہے تھے۔ جو میری آنکھیں دیکھ رہی تھیں اور جو میرے کان سن رہے تھے اس پر یقین کرتے ابھی بھی تامل ہو رہا تھا۔ اگر جو کاشف کے مشورے پر عمل کرتے ہوئے میں واقعی مشکوک لڑکیوں کی کوئی فہرست تیار کرتا بھی تو ان ''باجی جان'' کو کبھی اس میں شامل نہ کرتا۔

میری مجرم تو یہ میرے سامنے بیٹھی تھی۔ شکر ہوا جو جوش اور غصے میں آ کر میں حوریا نشو سے کچھ کہہ نہیں بیٹھا ورنہ میرے متعلق جو کچھ انہیں نہیں معلوم وہ سب آ بیل مجھے مار اور آپ اپنے پاؤں پر کلہاڑی مارنے کے مصداق میں خود اپنے منہ سے انہیں بتا کر اپنے لیے ایک نئی مصیبت مول لے بیٹھتا۔

باجی کے ہاتھ میں موبائل تھا اور بچیوں کے ہاتھ میں چھوٹا سا کیسٹ پلیئر، گھر سے فون یقیناً نازو نے اٹھایا تھا۔ آواز جس مہارت سے بدلی گئی تھی وہ میں اور امی نہ پہچان پاتے تو نازو جیسی عقل سے پیدل کے پہچان لینے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔

اس نے ضرور ہولڈ کرنے کو کہا تھا اور اب انہیں ہولڈ کروا کر میرے کمرے میں گئی ہوگی جہاں میں غصے میں پنکھا اے سی سب کھلا چھوڑ آیا تھا۔ میں ان تینوں بہنوں کے عین پیچھے کھڑا انہیں اپنا ہی انتظار کرتا دیکھ رہا تھا۔

''انگلی Play پر رکھو جیسے ہی وہ ہیلو کہے فوراً دبانا۔'' یہ ہدایت باجی صاحبہ نے کی تھی۔

''آ گیا، آ گیا۔'' وہ یقیناً نازو کے واپس فون کے قریب آنے کی آواز کو میرے قدموں کی آواز سمجھ کر جوش سے بولی۔ میں بے آواز چلتا ہوا آہستہ آہستہ ان تینوں کے بالکل سامنے آ کر کھڑا ہو گیا۔ نازو ابھی ان سے کچھ کہہ بھی نہیں پائی ہوگی کہ میں ہیلو بولا۔

سجدہ نے آؤ دیکھا نہ تاؤ جلدی سے Play کو دبا دیا مگر موبائل کان سے لگائے باجی اتنی عقل رکھتی تھیں کہ اپنے سامنے سے ابھرتی آواز اور موبائل سے آتی آواز میں فرق کر سکیں۔ اپنی بہنوں کی طرف گھمائی گردن انہوں نے سیدھی کی تو نظریں میرے جوتوں سے ٹکرائیں۔ اب دھک سے رہ جانے کی باری ان کی تھی۔ سر اٹھا کر دیکھنے پر انہیں میں نظر آیا۔ میں جس کی اس وقت اپنے گھر موجودگی کی یقیناً انہیں توقع تھی نہ امید۔ گھبراہٹ بوکھلاہٹ، پریشانی، شرمندگی، ندامت، اس جیسے تمام تاثرات اس وقت ان کے چہرے پر ابھرے، بھولی بچیاں بھی مجھے دیکھ چکی تھیں۔

گڑبڑا کر سجدہ نے جلدی سے منے کی شان میں بجتے کسی گیت کا گلا گھونٹا۔

''چلنے دیتیں، اتنا اچھا گا نا تھا۔'' میں بے فکری اور بے نیازی سے بولتا صوفے کے سامنے رکھی ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔

میری خوش قسمتی کہ میں اپنی مجرمہ کو رنگے ہاتھوں پکڑنے میں کامیاب ہو چکا تھا۔ جو میں نے سوچا نہیں تھا وہ ہو چکا تھا۔ مجھے ستانے، پریشان کرنے والے اور میرا مذاق اڑانے والی یہ گستاخ اور بدتمیز باجی اپنی اصلیت اس طرح ظاہر ہو جانے پر شرم سے پانی پانی ہو رہی تھیں۔

''آ، آپ۔'' بمشکل باجی کے منہ سے آپ کا لفظ بہت اٹکتے ہوئے نکلا۔

''جی میں۔ میں نے سوچا مجھ سے بات کرنے کے لیے آپ کو اس قدر تردد کرنا پڑتا ہے میں خود جا کر بہ نفسِ نفیس مل لیتا ہوں۔ بائی داوے میں قیس ہوں اور یہ بھی جانتا ہوں کہ اگر میں قیس ہوں تو آپ لیلیٰ ہیں اور یہ بھی کہ ابھی آپ ارتقائی مراحل طے کر رہی ہیں اور ابھی آپ کے خاتون بننے میں بیس پچیس سال کا عرصہ درکار ہے۔''

جسے یہ گمان اور یہ خوش فہمی تھی کہ وہ کبھی پکڑی نہیں جاسکتی اسے رنگے ہاتھوں پکڑنا اور شرمندہ ہوتے دیکھنا ایک بڑا ہی دلفریب اور خوشگوار منظر تھا۔

''سجدہ! حیا! یہ تمہارے فرقان انکل کا موبائل نہیں مل رہا۔ بے چارے جانے کے لیے کھڑے ہیں۔ سارا ڈرائنگ روم اور لاؤنج چھان مارا۔ ذرا تم دونوں میرے ساتھ ڈھونڈ واؤ۔'' باہر سے ہی بولتی آنٹی سلمیٰ اچانک ہی کمرے میں داخل ہوئیں۔

''ارے قیس تم؟'' بچیوں سے مخاطب ہوتے ان کی نگاہ مجھ پر پڑی۔ میں نے اٹھ کر انہیں باادب سلام عرض کیا اور اپنی آمد کی وجہ یعنی دادی جان کی داڑھ کے معائنے کا ذکر کیا۔ اس دوران کسی فرقان انکل کا موبائل باجی جان کے ہاتھوں سے چھوٹی بہنوں کی طرف منتقل ہو چکا تھا۔ اپنی والدہ کی نگاہوں سے بچتے دونوں چھوٹی بہنیں کیسٹ پلیئر اور کسی بے چارے فرقان انکل کا موبائل لیے کمرے سے کھسک لی تھیں۔ رہ گئیں ایمان باجی جان، تو وہ التجا کرتی بہت عاجزانہ نگاہوں سے میری طرف دیکھ رہی تھیں۔

میں ان کی والدہ محترمہ اور دادی جان کے سامنے ان کا پول نہ کھول دوں، میں نے آنٹی سلمیٰ سے خیر و عافیت پر مشتمل مختصر گفتگو کی، انہوں نے دادی جان کو سوتے سے جگایا تو ان کی داڑھ کا تفصیلی معائنہ کیا اور پھر بغیر افشائے راز کیے میں دادی جان اور آنٹی سلمیٰ سے رخصت لیتا اپنے گھر لوٹ آیا۔

اپنی دشمن کو میں نے معاف نہیں کیا تھا۔ اس سے بدلہ تو مجھے ہر حال میں لینا تھا مگر یہ نانیوں، دادیوں اور امیوں سے شکایتیں لگانے والا کام تو نرا واہیات اور زنانہ خصوصیات کا حامل تھا۔ اب یہی دیکھ لیں۔ اس وقت میری دشمن، کہیں میں اس کے یا اپنے گھر والوں میں سے کسی کو کچھ بتا نہ دوں، کے خوف کا شکار اپنے گھر پر دہشت سے یقیناً اندر ہی اندر دہل رہی تھی۔ عین اس وقت میں ایک منصوبے کو حتمی شکل دے لینے کے بعد پورچ سے اپنی گاڑی باہر نکال رہا تھا۔

''تمہارے منہ میں گھی شکر، ہائے کاش ایسا ہو جائے، سچی یہ پڑھائی وڑھائی ہم سے تو نہیں ہوتی۔''

باجی جان کے حسرتوں میں ڈوبے ان جملوں کو دہراتا میں گاڑی چلا رہا تھا۔ میرا رخ روڈ پار کر کے اگلے بلاک میں واقع حبیبہ خالہ کے گھر کی طرف تھا۔

☆

''علم روشنی ہے، جہالت تاریکی ہے۔''

''علم وہ دولت ہے جسے کوئی چرا نہیں سکتا۔''

''دولت نہیں، علم حاصل کرو۔''

''تم مجھے پڑھی لکھی مائیں دو، میں تمہیں اچھی قوم دوں گا۔''

''ماں کی گود بچے کی پہلی درس گاہ ہوتی ہے۔''

''مرد کی تعلیم صرف اسی کو نفع دیتی ہے جبکہ عورت کی تعلیم ایک پوری نسل کو سنوار دیتی ہے۔''

''عورت کی تعلیم کے بغیر کوئی معاشرہ ترقی نہیں کر سکتا۔''

''آبادی کے پچاس فیصد حصے کو تعلیم سے محروم رکھ کر آپ کبھی بھی ترقی نہیں کر سکتے۔''

چھٹی جماعت سے لے کر دسویں جماعت تک علم کی اہمیت، علم ہی کامیابی کی کنجی ہے، علم سب کے لیے، علم کا حصول ہر مسلمان مرد و عورت پر فرض ہے وغیرہ وغیرہ جیسے مضامین کے اردو کے پیپرز سے عین پہلے جو شاندار رٹے لگائے تھے شکر تھا کہ وہ حافظے میں محفوظ تھے اور بروقت اور صحیح موقع پر کام آ گئے تھے۔ جنید ظہیر کرسی پر بیٹھے تھے اور میں ان کے کمرے میں ان کے بالکل سامنے کھڑا ایک ماہر مقرر کی طرح جوشیلے انداز میں بول رہا تھا۔ عورتوں کی تعلیم، ان کے حقوق، ان کے مسائل، ان کی آزادی، انہیں مردوں کے ساتھ برابری کا درجہ دینا وغیرہ پر جو میں نے جوشیلے جملے کہے تھے اگر وہ آنٹی عاصمہ جہانگیر کے قبیل کی کوئی حقوقِ نسواں کی علمبردار آنٹی سن لیتیں تو مجھے شاباش کہہ کر میری پیٹھ ضرور تھپتھپاتیں۔ یہاں مجھے داد دینے کو فقط جنید ظہیر موجود تھے۔

وہ خاموشی سے میری بات سن رہے تھے اور میں شہنشاہِ جذبات بنا جذباتی اور قدرے رُندھی آواز میں انہیں بتا رہا تھا، ان کے جیسا علم کا متوالا، علم کا پیاسا، علم کا سودائی، علم کا شیدائی جو علم کا اجالا گھر گھر اپنوں اور غیروں کی تخصیص کے بغیر پہنچانے کو اپنا نصب العین بنا چکا تھا جو گاؤں گاؤں، بستی بستی، قریہ قریہ علم کا نور بکھیر دینے کا عزم کر چکا تھا خود اس کی اپنی ہونے والی نصف بہتر اس کی جانب سے شادی کی جلدی مچائے جانے کے سبب اپنے امتحان نہ دے پائے، شادی کے بکھیڑوں میں پڑ کر بعد میں اپنا حصولِ علم کا شوق پورا نہ کر پائے۔ چراغ تلے اندھیرا اس کو نہیں تو پھر کس کو کہتے ہیں۔

ایک لڑکی جو اردو ادب میں ایم اے، ایم فل بلکہ پی ایچ ڈی کرنے کے خواب دیکھا کرتی ہے وہ دورانِ تعلیم حصولِ علم کا سلسلہ منقطع کر کے شادی کی زنجیروں میں جکڑ کر گھر بٹھا دی جائے؟ جو اس خوف اور خدشے کے پیشِ نظر کچھ کہہ نہیں پا رہی کہ اس کی جانب سے شادی آگے بڑھا دینے کی بات کہیں اس کے ہونے والے شوہر صاحب اور سسرالیوں کو ناگوار نہ گزر جائے لیکن کیا اس کی خاموش فریاد کو علم کا یہ سچا عاشق سمجھ نہیں سکتا۔'' عاشق، سودائی اور شیدائی'' میں خاص زور ڈال کر بول رہا تھا۔ ''کیا اس بے چاری کی قسمت میں یہی لکھا ہے کہ اسے حصولِ علم سے جو اس کا پہلا اور سچا عشق ہے روک کر اس نگر بھیج دیا جائے جہاں اس سے اردو ادب پر تو کیا اردو زبان ہی میں بات کرنے والے خال خال نصیب ہوا کریں گے۔'' رومال سے بلاوجہ اپنی آنکھیں رگڑتے ایک گھنٹے اور تیرہ منٹ پر مشتمل اپنی تقریر دل پذیر کا جذباتی انداز میں میں نے اختتام کیا

اور بغور پروفیسر صاحب کی طرف دیکھا تو وہ سر پا ندامت و پشیمانی سر جھکا کر بیٹھے نظر آئے۔

''تم نے میری آنکھیں کھول دی ہیں۔انجانے میں میں ایک علم کی تلاش وجستجو میں سرگرداں لڑکی کے ساتھ کتنی بڑی زیادتی کرنے چلا تھا۔صرف اپنا بھلا سوچ رہا تھا کہ مجھے امریکہ میں اکیلے نہیں رہنا پڑے گا۔اس کا نہیں سوچا جسے حصولِ علم کی اتنی لگن ہے۔ان سے کہنا قیس! وہ ہرگز فکر نہ کریں جب تک وہ ایم اے نہیں کر لیتیں کوئی شادی کا نام بھی نہیں لے گا۔نہیں بلکہ تم رہنے دو۔میں خود انہیں جا کر یہ اعتماد دلا کر آؤں گا۔پہلے بے خبر تھا مگر اب جبکہ سب جان چکا ہوں تو تم دیکھنا قیس! علم سے اتنی عقیدت اور محبت رکھنے والی اس لڑکی کو میں اردو ادب میں پی ایچ ڈی کی سطح تک خود لے کر جاؤں گا۔''

پروفیسر صاحب نے شرمندہ لہجے میں بات کا آغاز کرنے کے بعد جوش، عزم اور غیر متزلزل ارادے پر مشتمل لفظوں کے ساتھ اپنی بات ختم کی جبکہ میں ''علم، عقیدت'' اور ''محبت'' کے لفظوں پر بمشکل لب بھینچ کر اپنی مسکراہٹ چھپا رہا تھا۔میری چشمِ تصور میں کسی کی لمبی لمبی جمائیاں اور نیند سے بند ہوتی آنکھیں آ رہی تھیں۔

☆

''آپ بے فکر ہو کر اپنی پڑھائی جاری رکھیں۔آپ کے ایم اے کر لینے سے پہلے ہماری شادی کی بات کسی نے کی تو اسے میں خود دیکھ لوں گا۔میں ڈاکٹریٹ کر آؤں، آپ یہاں ایم اے کر لیں شادی اس کے بعد بھی تو ہو سکتی ہے۔اتنی افراتفری مچانے کی آخر تک ہی کیا ہے؟''

یہ جنید ظہیر تھے جو امریکہ روانگی سے قبل ایئر پورٹ پر اپنی منگیتر سے بڑے مخلصانہ و دوستانہ انداز میں یہ وعدے کر رہے تھے۔انہیں رخصت کرنے سب کے ساتھ میں ایئر پورٹ قصداً ہی چلا آیا تھا۔سُن گُن لینے والے انداز میں وہیں پر ہی موجود تھا اور ان سچے پکے وعدوں پر جیسی بے چارگی و بے بسی کے تاثرات میری دشمن کے چہرے پر پھیلے تھے انہیں دیکھ کر کلیجے میں ٹھنڈی پڑ گئی تھی۔

سامنے اس سے رخصت لیتا بندہ اس کے علم کے متوالے ہونے کے گُن گا رہا تھا، اسے آج کل کی فیشن زدہ و دیگر خرافات میں مبتلا لڑکیوں سے مختلف بتا رہا تھا، علم و ادب سے سچا عشق رکھنے پر اسے تعریفیں کر کر کے ساتویں آسمان پر پہنچانے کی کوششیں کر رہا تھا۔وہ کچھ کہتی بھی تو آخر کیا؟ صرف جھوٹی برائیاں ہی نہیں جھوٹی تعریفیں بھی بندے کا بیڑا غرق کر سکتی ہیں۔

کچھ بے بسی، کچھ بے چارگی، کچھ جھنجلاہٹ اور کچھ ہونے والے اس عظیم احسان کے پیچھے کس کا نادیدہ ہاتھ کارفرما تھا وہ تخریبی ذہانت رکھنے والی لڑکی ظاہری بات ہے یہ بات جانتی تھی مگر بے بسی سی بے بسی تھی۔وہ میرے خلاف کچھ کہنے کی کیا منہ کھولنے کی بھی ہمت نہ کر سکتی تھی۔

☆

اور پھر کچھ یوں ہوا عزیزو کہ 1957ء کی جنگِ آزادی لڑنے کے بعد بھی میرے اور آپ کے آباؤ اجداد جو کمپنی بہادر یعنی ایسٹ انڈیا کمپنی کو اپنے ملک سے مار بھگانے میں ناکام ہو گئے تھے۔میں ان کے مقابلے میں خوش قسمت ٹھہرا کہ بغیر لڑے کمپنی بہادر کی سی خصوصیات رکھنے والے ایک گھرانے کو اپنے گھر سے بھگانے میں کامیاب ہو کر ایک نئی تاریخ رقم کر گیا۔میں تو صرف اپنی دشمن کو اس کی گستاخیوں کی سزا دینا چاہتا تھا

مگر اپنی دشمن کو دعائیں دینے کو جی چاہتا ہے جس نے میرا مذاق مسلسل اڑا کر اور پھر رنگے ہاتھوں پکڑے جا کر میرا دوسرا مسئلہ یعنی ایسٹ انڈیا کمپنی سے چھٹکارا و نجات با آسانی حل کروا دیا۔ ان دنوں حالات کچھ یوں ہیں کہ امی کو پڑوسیوں کی مفت سلائی، کڑھائی سکھانے اور پڑھانے سے فرصت مل گئی ہے اور ان کی پوری توجہ اپنے اکلوتے بیٹے پر مرکوز ہو گئی ہے۔ نانو اور دادی اماں کو اپنا گھر اور گھر کا ساز و سامان مفت خورے پڑوسیوں کو دینے سے نجات حاصل ہو گئی ہے۔ ابو اور مجھے وقت بے وقت کسی بچی کے ذریعے بلوا کر مفت علاج معالجے کے مزے لیے جانے بھی تقریباً ختم ہو گئے ہیں۔

دادی اماں، نانو اور امی ان دنوں اکثر اس موضوع پر اظہار خیال کرتی نظر آتی ہیں کہ پڑوس سے ''بچیوں'' نے آنا جانا کیوں بند کر دیا۔

ایمان تو چلو ''پڑھائی'' میں مصروف ہے، چھوٹی بچیوں، ان کی دادی جان اور ''نیوانٹری'' ان کی والدہ صاحبہ کو کیا ہوا۔

میں کہ ٹھہرا نیک خصلت، شریف و با کردار نوجوان، یہ سوچ کر لبوں پر قفل لگائے رکھتا ہوں کہ آج میں کسی کا پردہ رکھوں گا تو کل اللہ میرا پردہ رکھے گا۔

چلتے چلتے یہ بھی بتا دوں کہ وہ تینوں بہنیں اب ہمارے گھر میں تو کیا گرد و نواح میں بھی شاذ و نادر ہی دکھا کرتی ہیں۔ ویسے پڑوسیوں کی زیادہ نہیں مگر اڑتی اڑتی خبر تو میں رکھتا ہوں۔ کہاں شادی کی تیاریاں تھی اور سسرالیوں و میاں جی کا دل جیتنے کے لیے میری امی سے نئی نئی ڈشز پکانی سیکھی جا رہی تھی۔ اور کہاں اب سر پر امتحانات کی تلوار ہے۔ بی اے کے بعد ایم اے کا عذاب ہے، دن کے چوبیس گھنٹے کتابیں ہیں، نوٹس ہیں، رٹے ہیں، سریلے گیتوں کے بجائے مغلیہ سلطنت کے زوال کے اسباب خطبۂ الہ آباد، اردو ادب میں قصے و داستان گوئی کی تاریخ، دلی و لکھنؤ کے شعراء کا تقابلی جائزہ وغیرہ نیند بھگا بھگا کر رٹے جاتے ہیں۔

میں ان دل خوش کن مناظر کو دیکھ تو نہیں پاتا پر دیکھے بغیر بھی کتابوں سر دیئے، جمائیاں روک روک کر نیند بھگاتی باجی جان کا تصور میں با آسانی کر سکتا ہوں۔ میں نے ایک لڑکی سے انتقام لیا، آپ کو شاید میری یہ حرکت مردانہ وقار کے خلاف لگی ہو، لیکن ٹھہریں، یہ تو سوچیں کہ میرے اس انتقام میں بھی دراصل میری دشمن ہی کا مفاد پوشیدہ ہے۔ شعر و شاعری کا شوق رکھنے والی ایک اچھی خاصی ذہین لڑکی اپنی ذہانتوں کا تخریبی انداز میں استعمال کر رہی تھی۔ پڑھانے پر بضد میری امی جان سے قصداً بے وقوفانہ باتیں اسی غرض سے کی گئی تھیں کہ وہ آئندہ انہیں پڑھانے سے کان پکڑ کر توبہ کر لیں۔ استاد سے استادی۔ میری بھولی ماں کے ساتھ مکاری و عیاری۔ ایک ذہین لڑکی کی تخریبی ذہانت کو میں نے تعمیر کی طرف لگا دیا، جنید ظہیر کی آنے والی نسل کے لیے ایک پڑھی لکھی ماں کا بندوبست کروا دیا، ویسے پڑھی لکھی کے لفظ سے یاد آیا ہفتہ دس دن پہلے کی بات ہے میں کالج جانے کے لیے گاڑی گیٹ سے نکال رہا تھا جب اپنی کالج وین کا انتظار کرتی ''باجی جان'' سے میرا سامنا ہوا تھا۔ وین کا انتظار بھی ہو رہا تھا اور ہاتھ میں پکڑی کسی کتاب میں سے رٹے بھی لگائے جا رہے تھے۔ آنکھیں ویسی ہی سرخ اور نیند سے بھری نظر آ رہی تھیں، مجھ پر نظر پڑی تو محترمہ نے بہت غصے سے منہ دوسری طرف پھیر لیا۔ تب ان ہی کے پسندیدہ شغل یعنی اشتہارات پر ہاتھ صاف کرنے پر عمل کرتے میں ان کی طرف دیکھے بغیر لاپروائی و بے نیازی سے اس آواز میں جو ان تک پہنچ جائے، گنگنایا تھا۔

"ہر بندہ پڑھانا ہے۔

سنگ اپنا فرض نبھانا ہے۔

ایک ہی مقصد، ایک ہی نعرہ۔

پڑھا لکھا بیگ ہاؤس ہمارا۔"

ہاں ایک ضروری بات تو میں بتانا ہی بھول گیا وہ جہاں سے میں نے اپنے قصے کا آغاز کیا تھا یعنی دادی اماں اور نانو کے مجھے ننھے بچوں کی طرح ٹریٹ کرتے انداز اور شرمندگی، خجالت وجھنجھلاہٹ میں مبتلا کرتے بے جا اور تکلیف دہ ناز نخرے تو جناب اس تکلیف دہ حد تک بڑھے غیر معقول ونامناسب لاڈوں سے مجھے اسی روز نجات حاصل ہوگئی تھی جس روز میں نے اپنی محترمہ کو رنگے ہاتھوں پکڑا تھا۔آپ کو یاد ہوگا میں نے بتایا تھا ان کے فون کرنے پر نازو نے انہیں ہولڈ کروایا تھا اور پھر کسی کے آنے کو میرا آنا سمجھ کر باجی اور ان کی بہنوں نے جلدی سے منے کی شان میں کوئی گستاخانہ گیت چلایا تھا تو ہوا کچھ یوں تھا کہ وہ آنے والی شخصیت دادی اماں کی تھی جنہیں میری عدم موجودگی کے سبب نازو بلا لائی تھی کہ میرے لیے آنے والا فون سن لیں اور نام وپیغام نوٹ کرلیں۔

میں نے اس گیت پر ان لمحات میں کچھ خاص توجہ نہ دی تھی۔ یقیناً وہ اتنا ہی بے ہودہ وگھٹیا ہوگا جتنے اس سے قبل کے گیت ہوا کرتے تھے مگر اس رات میں نے دادی اماں کو نانو سے اس بات پر جھگڑتے سن لیا تھا کہ "منا" اب بڑا ہوگیا ہے۔انہیں آئے گئے کے سامنے اس کی عزت کا پاس رکھنا چاہیے۔نجانے کون لڑکی ہے جو ان کے منے کا اتنی بدتمیزی وگستاخی سے مذاق اڑا رہی تھی۔ وہ اس انجانی لڑکی کو غائبانہ بے تحاشا صلواتیں سنا رہی تھیں جو ان کے لاڈلے پوتے کا اس طرح مذاق اڑا رہی تھیں۔

اس روز کے بعد سے میری دنیا ہی بدل گئی۔لنچ باکس اور پانی کی بوتلوں سے مجھے نجات مل گئی۔دادی اماں اور نانو کے پیار میں معقولیت اور سجاؤ آ گیا۔اپنی دشمن سے چاہے مجھے جتنی بھی پرخاش ہو پر اس لڑکی کو یہ کریڈٹ میں بہرحال دوں گا کہ دادی اماں ونانو کے آگے میری التجائیں، صدائیں اور فریادیں وہ کام نہ کر پائیں جو اس لڑکی کے مذاق اڑانے نے کر ڈالا۔خیر اس کے اس احسان کا بدلہ میں بھی اسے بے پڑھی لکھی لڑکی کو پڑھا لکھا بنانے میں عملی تعاون وخدمات انجام دے کر اتار ہی چکا ہوں۔

جنید ظہیر کے ڈاکٹریٹ کر کے پاکستان لوٹ آنے تک باجی صاحبہ ایم اے پاس ہوجائیں گی یا بی اے فیل رہیں گی یہ تو آنے والا وقت ہی بتائے گا۔وہ وقت آنے دیں پھر میں آپ کو اس کا بھی تفصیلی احوال ضرور سناؤں گا۔تب تک کے لیے مجھے اجازت دیں۔یار زندہ صحبت باقی۔